علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم

طلوعِ اسلام

ایک ملی اسلامی مجلہ

ستمبر ۱۹۳۱ء

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا

ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

دورِ جدید

بدل اشتراک		مرتّب
سالانہ	پانچ روپیہ	اخوندزادہ حسین امام
ششماہی	تین روپیے	
فی پرچہ	آٹھ آنے	

جلد ۴ — شمارہ ۹

شعبان المعظم ۱۳۶۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۱ — ۲۰
لمحۂ فکریہ	〃	۲۱ — ۳۱
نغمۂ شوق	جناب اسد ملتانی	۳۲
نظریۂ اضافیت	جناب سر شاہ محمد سلیمان صاحب (مرحوم)	۳۳ - ۴۷
ایک ہم نشین سے خطاب	جناب الطاف حسین صاحب۔ ایم۔ اے۔ اے۔ ٹی۔ ایس جبلپور	۴۸
سلیم کے نام آٹھواں خط	جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۴۹ - ۶۰
نقد و نظر	ادارہ	۶۱ - ۶۸
حقائق و عبر	〃	۶۹ - ۷۷
باب المراسلات		۷۸ - ۸۰

لمعات

دل میں گریہ نے پھر اک شور اٹھایا غالبؔ　　　آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

ہم قریب ڈیڑھ برس سے اس حقیقت کا اعلان کرتے چلے آرہے تھے کہ جسدِ ملت میں ایسے عناصر جمع ہوتے چلے جارہے ہیں جو ایک نہ ایک دن اس کے تمام نظام میں فساد پیدا کرنے کا موجب بن جائیں گے اس لئے ضرورت ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو۔ ان اخلاطِ فاسدہ کی اصلاح یا استیصال کیا جائے۔ رفتہ رفتہ ان مادوں کی کثافت بڑھتی چلی گئی لیکن کم از کم ہمارے اندازہ کے مطابق ان کا علاج صحیح طور پر نہ ہوا۔ ہوا صرف اتنا کہ انہوں نے کہیں پھنسی کی شکل میں سر ابھارا تو اس پر مرہم لگادی گئی۔ کہیں ورم نمودار ہوا تو اسے اندر دبانے کی کوشش کردی گئی۔ حالانکہ یہ پھوڑے اور پھنسیاں یہ ورم اور سوزش درحقیقت علاماتِ مرض تھیں۔ علتِ مرض نہ تھیں۔ علت تو یہ تھی کہ خون میں فساد انگیز مادے حلول کرچکے ہیں۔ علاج علتِ مرض کا ہونا چاہیئے تھا نہ کہ علامتِ مرض کا۔ رفتہ رفتہ ان مادوں کا اثر متعدی ہوتا گیا اور پنجاب سے آگے بڑھ کر بنگال تک جا پہنچا اور اس کے بعد یہ مواد اس برسات میں ایک ایسے خطرناک پھوڑے کی صورت میں باہر آگیا جس کے لئے طبیبِ مشفق کو نشتر لے کر اٹھنا پڑا۔ زخم گریاں ہے۔ مریض لرزاں ہے اور کوتاہ اندیش تیماردار گلہ مند ہیں کہ جراح سخت گیر ہے اور نشتر تیز۔ حالانکہ اگر وہ مریض کے سچے غمخوار ہوتے تو انہیں سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ جس انگلی کا ناسور سارے جسم میں ہلاکت آفریں زہر کا موجب بن رہا ہو اس کا کاٹ پھینکنا ہی مریض کی اصلی غمخواری ہے۔ ایسے میں مریض کو یہ کہہ کر ڈرانا کہ اگر انگلی کٹ گئی تو ہاتھ بے کار ہو جائے گا۔ مریض کی ہمدردی نہیں غمخواری کے پردے میں بدترین دشمنی ہے۔

ایک دنیا دیکھ رہی تھی کہ سر سکندر حیات خاں صاحب لیگ کے اساسی مبادیات کے خلاف کس طرح آئے دن کھلی ہوئی سرکشی اختیار کر رہے ہیں۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ ان کی اس روش پر صدرِ مسلم لیگ کو کس قدر شکایت ہے

جوان کے دلوں میں بُعد پیدا کرتی جارہی ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ ناعاقبت اندیش "غم خوار" اس حقیقت پر بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہے اور یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ جب صدر جناب جناح نے حالات سے مجبور ہو کر تادیبی کارروائی کا اعلان کر دیا تو اس وقت بھی، بجائے اس کے کہ یہ لوگ ان ملزمین کو سمجھاتے کہ حقیقی عزت اور ملت کی بہی خواہی کا راز ضبط و اطاعت میں ہے۔ انھوں نے ایک عجیب روش اختیار کر لی اور واویلا مچانا شروع کر دیا کہ "لیگ کو تفرقہ سے بچاؤ"۔ "ملت میں انتشار نہ پیدا ہونے دو"۔ آپ ان "خطرہ کی گھنٹیوں" کا ذرا غور سے تجزیہ کیجئے اور سوچئے کہ ان لیگ اور ملت کے درد سے کراہنے والوں کا مقصد کیا تھا؟ لیگ میں تفرقہ اور ملت میں انتشار پیدا ہونے کی ایک یہی صورت ہو سکتی تھی کہ مسلم لیگ سے وابستہ ہونے کے مدعی وزراء اور دیگر اراکین کے خلاف "تادیبی کارروائی" کی جاتی اور یہ حضرات بجائے اس کے کہ لیگ کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے، سرکشی اختیار کر لیتے یعنی تفرقہ کے لیے دو صورتوں کی موجودگی ضرور تھی۔

(۱) لیگ کا فیصلہ کہ ملزمین کا جرم ثابت ہو جانے پر ان کے خلاف "تادیبی کارروائی" کی جائے۔

(۲) مجرمین کی اس فیصلہ کے خلاف سرکشی۔

اس خلفشار میں جو پچھلے دنوں ملتِ اسلامیہ کی سیاسی فضا میں پیدا ہو گیا۔ ہر مخلص اور عاقبت اندیش بہی خواہ کا فرض تھا کہ ان ملزمین کو تلقین کرتا کہ اگر لیگ نے ان کے خلاف فیصلہ دیا تو ان کا فرض ہونا چاہیئے کہ قوم کو شکست و انتشار سے بچانے کی خاطر اس فیصلہ کے خلاف سرکشی اختیار نہ کریں لیکن ان غم خوارانِ ملت نے الٹا لیگ کو دھمکانا شروع کر دیا۔ کہ دیکھنا اگر تم نے ان لوگوں کے خلاف "تادیبی کارروائی" کی تو ملت میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے قطعاً یہ قدم نہ اٹھانا یعنی بالفاظِ دیگر وہ ان ملزمین حضرات کو اکسا رہے تھے کہ اگر لیگ نے ان کے خلاف "تادیبی کارروائی" کی تو تم اس کے فیصلے کے سامنے ہرگز سر نہ جھکانا۔

جناب جناح کے "تادیبی کارروائی" کے متعلق اعلان شائع ہونے کے بعد سب سے پہلے جو آواز لاہور سے بلند ہوئی تو وہ یہ تھی کہ محمد علی جناح صاحب نہ تو پوری ملت ہیں نہ پوری لیگ۔ ان کی حیثیت ایک فرد کی ہے اس لئے کیا ضرور ہے کہ ان کا فیصلہ ضرور قابلِ قبول سمجھا جائے! سر سکندر حیات خاں صاحب کے حمایت کے جوش میں یہ ایک ایسی

ذہنیت کا مظاہرہ تھا جس پر شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اظہار تاسف نہ کرے اس میں شبہ نہیں کہ محمد علی جناح کی حیثیت صرف ایک فرد کی ہے لیکن صدر مسلم لیگ اس خاص باب میں تو پوری کی پوری ملت اور پوری کی پوری لیگ ہیں۔ ہر وہ مسلمان جو مسلم لیگ کو ملت اسلامیہ ہندیہ کا ترجمان سمجھتا ہے۔ بلا تامل تسلیم کرے گا کہ ملت اسلامیہ مسلم لیگ کے اندر سموئی ہوئی ہے۔

مسلم لیگ نے انتظامی اور اصولی امور کو بروئے کار لانے کے لئے اپنے میں سے ایک مجلس عاملہ منتخب کر رکھی ہے جو ان امور میں پوری کی پوری لیگ کی نیابت کرتی ہے۔

لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنے ایک خاص اجلاس میں ایک ریزولیوشن پاس کر رکھا ہے جس کی رو سے ان معاملات (بالخصوص موجودہ سیاسی خلفشار کے سلسلہ) میں تمام امور کے متعلق فوری کارروائی کرنے کے تمام اختیارات صدر مسلم لیگ کو تفویض کر رکھے ہیں۔

ان حقائق کے پیش نظر یہ فرمائیے کہ جب صدر مسلم لیگ نے یہ اعلان کیا کہ لیگ کی پالیسی سے انحراف کرنے والوں کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی تو کیا یہ (اصول بالا کی روشنی میں) (۱) مجلس عاملہ کا فیصلہ (۲) مسلم لیگ کا فیصلہ اور (۳) ملت اسلامیہ کا فیصلہ نہیں ہے؟ آپ پہلے اپنے ان تمام معاملات کے متعلق فیصلوں کے اختیارات صدر مسلم لیگ کے سپرد کرتے ہیں اور جب وہ اپنے ان اختیارات کے ماتحت کوئی فیصلہ کرتا ہے تو آپ کہہ دیتے ہیں کہ آپ نہ تمام مسلم لیگ ہیں نہ تمام ملت! آپ کو حق کیا حاصل ہے کہ اس قسم کے فیصلے صادر کر دیا کریں؟

یعنی جب تک صدر مسلم لیگ آپ کی مرضی کے مطابق فیصلے کرتے جائیں وہ مسلم لیگ بھی ہیں اور ملت اسلامیہ بھی اور جوں ہی ان کی طرف سے کوئی ایسا فیصلہ ہوا جو آپ کی منشا کے خلاف ہے تو آپ نے جھٹ سے کہہ دیا کہ آپ ہوتے کون ہیں! کیسی معقول ہے یہ روش اور کس قدر آئین و دستور کے مطابق یہ ارشاد!! باقی رہا یہ سوال کہ اس دور جمہوریت میں صدر مسلم لیگ کی یہ آمرانہ مطلق العنانی "جائز" ہے یا نہیں۔ سو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا وقت وہ تھا جب لیگ کی مجلس عاملہ نے ایسے آمرانہ اختیارات اپنے صدر کو تفویض کئے تھے۔ اپنے خلاف فیصلہ صادر ہونے پر جمہوریت اور آمریت کی اصولی بحث بہت بعد از وقت ہے اور اگر آپ کو آج بھی اس کے خلاف شکایت ہے تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مجلس عاملہ سے کہئے کہ وہ اپنے اس فیصلے کو واپس لے لے نہ یہ کہ لوگوں کو اکسائیے کہ ایسا آمرانہ حکم قابل قبول ہی نہیں!

وزراء حضرات کی مدافعت میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی رہی ہے کہ جب مسلم لیگ نے وار کونسلوں میں ان کی انفرادی شرکت کی اجازت دے دی تھی تو نیشنل ڈیفنس کونسل بھی تو اسی قسم کی جنگی کونسل کا نام ہے۔ اس میں انہوں نے شرکت کی تو لیگ کے اصول سے کسی طرح انحراف ہو گیا!

ہمیں حیرت ہے کہ ان حضرات نے محض مدافعت کا فریضہ ادا کرنے کے لیے حقائق سے کس درجہ چشم پوشی کر لی۔ حالانکہ ہمارا خیال ہے کہ اپنے دل میں غالباً ان حضرات کو بھی دلیل کی کمزوری کا اعتراف ہو گا۔

کسے معلوم نہیں کہ سال گذشتہ جناب وائسرائے نے اپنی اگزیکٹو کونسل کی توسیع اور سنٹرل وار ایڈوائزری کونسل کی تشکیل کے لیے مسلم لیگ اور کانگرس کو تعاون کی دعوت دی تھی۔ اس پر صدر مسلم لیگ (جناب جناح) نے تعاون کے لیے یہ شرائط پیش کی تھیں کہ مسلمانوں کو پچاس فی صدی نمائندگی دی جائے۔ اور اگر کانگرس شرکت نہ کرے تو پھر مسلمانوں (یعنی لیگ کے نمائندوں) کی اکثریت ہو۔ حکومت کو یہ شرائط منظور نہ تھیں وہ اگزیکٹو کونسل میں مسلمانوں کے دو نمائندے لینا چاہتی تھی اور وار کونسل میں بھی ان کی اقلیت ہی رکھتی تھی۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس منعقدہ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء میں ان شرائط کو مسترد کر دیا۔ البتہ پنجاب اور بنگال کے وزراء کے زور دینے پر لیگ کے ممبروں کو ان کی ذاتی حیثیت سے صوبجاتی وار کونسلوں میں شرکت کی اجازت دے دی۔

اگزیکٹو کونسل کی توسیع اور سنٹرل وار ایڈوائزری کمیٹی کی تشکیل کی وہی اسکیم اب منصۂ شہود پر آ گئی۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ سنٹرل وار ایڈوائزری کمیٹی کا نام نیشنل ڈیفنس کونسل رکھ دیا گیا۔

اگزیکٹو کونسل میں وہی دو مسلمان ممبروں کا اضافہ اور نیشنل ڈیفنس کونسل میں مسلمانوں کی اقلیت! یعنی وہی اسکیم جسے سال گذشتہ مسلم لیگ نے اپنے اس اجلاس میں مسترد کیا تھا جن میں جناب وزیر اعظم پنجاب اور بنگال خود شریک تھے۔

فرمائیے کہ ان حقائق کی روشنی میں یہ عذر بار بار پیش کرنا کہ ڈیفنس کونسل صوبجاتی وار کمیٹیوں کے مرادف ہے کس قدر ابلہ فریبی بلکہ خود فریبی پر مبنی ہے! ڈیفنس کونسل صوبجاتی وار کمیٹی نہیں۔ بلکہ وہ اسکیم ہے جسے مسلم لیگ نے کھلے الفاظ میں مسترد کیا تھا! اور ان لوگوں کے سامنے مسترد کیا تھا جنھوں نے اب لیگ سے پوچھے بغیر خود بخود اس میں شرکت کر لی اور اس کے بعد سینہ تان کر کہتے پھر رہے ہیں کہ جناح کو کوئی حق نہیں ہے کہ ہمارے اس یکسر آئینی اقدام پر تادیبی۔۔۔۔ کارروائی کرے!

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے!

ہم نے کسی سابقہ اشاعت میں ایک لیگی وزیر اعظم کو دانا دشمن اور دوسرے کو نادان دوست لکھا تھا۔ اس ہنگامہ میں بھی ان حضرات کی طرف سے اس قسم کی ذہنیت کے مظاہرے ہوئے۔ سر سکندر حیات خاں صاحب نے خود ایک لفظ نہیں کہا لیکن اپنے حاشیہ نشینوں کے ذریعہ سے جناب جناح اور مسلم لیگ کے خلاف منظم پروپیگنڈا کرا دیا چنانچہ ان کے مشہور دست راست سر چھوٹو رام صاحب نے تو اپنی ایک تقریر میں کھلے بندوں کہہ دیا کہ "مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کو ٹھکرا دو۔ مجھ پر اور سر سکندر حیات خاں صاحب پر اعتماد کرو" (ہندوستان ٹائمز ۲۲ ـــــ ہ/اگم) اس کے برعکس کوئی دن ایسا نہیں گزرا ہو جناب فضل الحق صاحب نے اپنے مشہور جذباتی طوفان کا ثبوت نہ دیا ہو۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ پنجاب میں سر سکندر حیات خاں صاحب کو پریس اور دوسرے پروپیگنڈا کرنے والے آسانی سے مل جاتے ہیں اور بنگال میں ایسا مشکل ہے اگر اس وجہ یہ ہے تو بنگال کو جس قدر بھی مستحق تبریک ذہنیت سمجھا جائے کم ہے پنجاب نے تو مسلمانوں کی رہی سہی آبرو بھی خاک میں ملا دی۔

اس ہنگامہ میں سر سکندر حیات خاں صاحب کی مسلم دوستی کا ایک اور ثبوت خود پنجاب ہی کے ایک اخبار سے ملا روزنامہ انقلاب نے اپنی ۱۲ اگست کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ سر سکندر حیات خاں صاحب نے جناب وائسرائے سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مسلم لیگ کی نمائندگی کے بغیر اگزیکٹو کونسل کی توسیع اور ڈیفنس کونسل کے قیام سے کچھ خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکیگا اس کے بعد تحریر ہے۔

> "لیکن جس وقت وائسرائے صاحب نے سردار صاحب کے مشورہ پر عمل نہ کیا اور ساتھ ہی سردار صاحب کو معلوم ہوا کہ وائسرائے صاحب اگزیکٹو کونسل میں کسی پنجابی کو شامل نہیں کر رہے ہیں اور چودھری سر ظفر اللہ خاں کے جانے کے بعد کونسل میں کوئی پنجابی ممبر نہ ہوگا تو آپ نے پنجاب کے "نمائندہ اولین" کی حیثیت سے اپنے صوبہ کی اس حق تلفی کو محسوس کیا اور اس مسئلہ کو اپنی وزارت میں پیش کر کے یہ فیصلہ کرا لیا کہ اگر وائسرائے اپنی کونسل میں کسی پنجابی کو شامل کرنے پر کسی طرح پر بھی آمادہ نہ ہوں تو سر سکندر اور ان کی ساری وزارت اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائے اس مطالبہ میں صرف پنجاب کی نمائندگی پر زور دیا گیا تھا۔ کسی شخصیت کا ذکر نہ تھا چنانچہ وائسرائے

نے پنجاب کی وزارت کا مطالبہ مان لیا اور سر فیروز خاں نون اگزیکیٹو کونسل میں شامل کر لئے گئے۔

"ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معاملہ میں سر سکندر سے مسلم لیگ کے خلاف کونسی حرکت سرزد ہوئی آپ نے کونسل کی توسیع کے وقت مسلم لیگی کی حیثیت سے اپنا رویہ وائسرائے پر واضح کر دیا اور اس سے زیادہ آپ کیا کر سکتے تھے"۔

غور فرمایا آپ نے! سر سکندر نے وائسرائے پر لیگ کا نقطۂ نظر واضح کر دیا۔ وائسرائے صاحب نے اسے سنا اور اس پر کوئی توجہ نہ دی سر سکندر صاحب خاموش ہو گئے کہ انھوں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا تھا۔

وائسرائے نے اپنی کونسل میں کسی پنجابی ممبر کو شامل نہ کیا۔ سر سکندر نے وائسرائے صاحب پر اس کو بھی واضح کر دیا اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اگر انھوں نے ان کے اس مطالبہ کو منظور نہ کیا تو وہ استعفیٰ دیدینگے۔ یعنی لیگ کے مطالبہ کے استرداد پر سر سکندر صاحب خاموش ہو گئے کہ "اس سے زیادہ آپ کر ہی کیا سکتے تھے" لیکن ایک پنجابی کے عدم انتخاب پر آپ استعفیٰ تک دینے پر تیار ہو گئے! (یاد رہے کہ انھوں نے سکھوں کے احتجاج پر بار بار اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ مطالبہ صرف پنجابی کا تھا۔ پنجابی مسلمان کا نہ تھا اور پنجابی مسلمان کا بھی ہوتا تو بھی پنجاب کا ہی مسئلہ تھا)

غور فرمایا آپ نے کہ مسلم لیگ کے مطالبہ کی سر سکندر کی نگاہ میں کیا حیثیت ہے! اتنی بھی نہیں جتنی ایک پنجابی ممبر کے انتخاب کی! اگر وہ لیگ کے مطالبہ کے استرداد پر اپنے رفقاء وزراء سے استعفیٰ نہیں لے سکتے تھے تو کم از کم اتحاد پارٹی کے وہ تمام مسلمان ممبر جو لیگ کے ممبر ہونے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں ان سے استعفیٰ لے کر اپنے استعفیٰ سمیت تو وائسرائے صاحب کو دکھا سکتے تھے؟

لیکن انھیں لیگ اور اس کے مطالبات سے کیا دلچسپی!

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہ حضرات ڈیفنس کونسل کی رکنیت کے لئے بہ حیثیت وزیر اعظم نامزد کئے گئے تھے اس لئے کوئی راہ فرار باقی نہ تھی۔ جب تک یہ وزیر اعظم رہیں گے ان کی اس قسم کی "مجبوریوں" کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔

یہ بھی غلط ہے۔ مسٹر ایمرے نے اپنے ۱۹ اگست کے بیان میں یہ کہا ہے کہ ان حضرات کو "وائسرائے نے دعوت دی تھی" کہ وہ ڈیفنس کونسل میں شریک ہوں اور جناب فضل الحق صاحب نے اپنے "جواب دعوے" میں خود تسلیم کیا ہے کہ انھوں نے اس دعوت پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا تھا اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ حضرات اس رکنیت کے لئے بحیثیت

وزیر اعظم آئینی طور پر مجبور تھے تو اس کے لئے فقط احکام نافذ کرنے کی ضرورت تھی" دعوت اور پھر دعوت کی قبولیت" کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے اور اگر بفرض محال ایسا ہی تھا کہ انھیں بہ حیثیت وزیر اعظم کونسل کی شرکت پر مجبور کیا جا رہا تھا تو کیا ان کے لئے ضروری نہ تھا کہ اپنی جماعت (مسلم لیگ) سے پوچھتے کہ معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے - ہم ایک ایسے کام کے لئے مجبور کئے جا رہے ہیں جو لیگ کے آئین کے خلاف ہے - اگر ہم اسے قبول نہیں کریں گے تو ہماری وزارت عظمیٰ باقی نہیں رہے گی - فیصلہ دیجئے کہ وزارت کو قائم رکھا جائے یا اس مطالبہ کو ٹھکرا دیا جائے - بہرحال جہاں تک ہم حالات کا تجزیہ کر سکتے ہیں ہمارے نزدیک ان منحرف حضرات کا طرزِ عمل کوئی وجہِ جواز اپنے اندر نہیں رکھتا یہ لیگ کے آئین کی کھلی بغاوت تھی جو انھوں نے کی اور اس امر کی قطعاً پروا نہ کی کہ اس سے ملت کے مفادِ عامہ کو کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے -

پھر جناب جناح کی تنبیہ پر ان حضرات اور ان کے حاشیہ نشینوں کی طرف سے جس بری ذہنیت کا مظاہرہ ہوا وہ بھی تاریخ میں اپنی یاد قائم رکھے گی - سر دست اس کے متعلق زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہیئے - معاملہ لیگ کی مجلس عاملہ کے سامنے آنے والا ہے - وہاں حقائق خود بخود بے نقاب ہو جائیں گے - ہم کوشش کریں گے کہ رسالہ کو ایک آدھ دن کے لئے روک لیا جائے تاکہ لیگ کا فیصلہ بھی سامنے آ جائے - لیکن ممکن ہے حالات اس کی اجازت نہ دیں - اس صورت میں ہم اپنے ان تمام فریب خوردہ بھائیوں سے درخواست کرینگے جنھوں نے ایک ایسے کھلے ہوئے مسئلے کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا کہ وہ اپنی ضد اور ہٹ کو چھوڑ دیں - غلطی کا اعتراف کر لیں اور مجلس عاملہ کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں - زندگی میں کئی مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں جھک جانا ہی سب سے بڑی سرفرازی اور اعترافِ شکست ہی سب سے بڑی قوت ہوتی ہے جہاں تک سر سکندر کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ پنجاب میں سکھوں کی طرف سے جو حالات پیدا کئے جا رہے ہیں ان کے پیشِ نظر وہ مصلحت اسی میں دیکھیں گے کہ سر دست لیگ سے بگاڑ نہ ہی کیا جائے -

باقی رہے ان حضرات کے "حمایت کرنے والے" سو ان سے ہم عرض کریں گے کہ غلطی کرنے والے کو اس کی غلطی سے آگاہ کر دینا - سب سے بڑی وفاشعاری ہوتی ہے - غلط روی کی بیجا حمایت قوم کے لئے نقصان جس کی حمایت کی جائے اس کی تخریب اور انجام کار خود اپنی ذلت کا باعث ہوا کرتی ہے فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (کیا کوئی ہے

جو اس سے نصیحت حاصل کرے؟

اس ہجوم پراگندگی میں میرٹھ کے مسلمانوں نے جس آئین پرستی اور اطاعت شعاری کا ثبوت دیا وہ در خور ہزار تہنیت ہے۔ نواب چھتاری میرٹھ میں تشریف لا رہے تھے وہ بھی ان میں سے ہیں جن کے خلاف لیگ کے آئین کی خلاف ورزی کا الزام ہے۔ میرٹھ کے مسلمانوں نے فوراً جناب جناح سے استصواب کیا کہ نواب صاحب کی آمد پر ان کی کیا روش ہونی چاہیئے جو فیصلہ وہاں سے ملا وہ اسی پر عمل پیرا ہوئے۔

اس ماہ کی "افواہوں" میں سے ایک گرم افواہ یہ بھی ہے کہ احرار بھی مسلم لیگ میں شمولیت کا ارادہ کر رہے ہیں۔ کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

بہرحال صبح کا بھولا شام کو بھی گھر آجائے تو اسے بھولا نہ کہیئے اگر اس افواہ میں کچھ حقیقت ہے اور ان گم گشتہ حضرات کا یہ فیصلہ اپنی غلطی کی اصلاح کی غرض سے ہے تو ہمیں ان کے اس اقدام سے خوشی ہوگی۔ پچھلے دنوں ان حضرات کی طرف سے پاکستان کی تائید میں جو تقاریر ہوئی ہیں ان سے اس افواہ کو تائید ملتی ہے۔ اگر انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تو ایک بات بالکل واضح ہے کہ انہیں اپنی جداگانہ جماعتی حیثیت کو پہلے ختم کرنا ہوگا اور اس کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہونا ہوگا یعنی مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد "مجلس احرار کا وجود" باقی نہیں رہ سکتا۔ اور یوں کہے چلے جانے کی تو اور بات ہے: "احرار" کا وجود تو پہلے ہی باقی نہیں رہا ابھی دو تین روز ہوئے۔ دہلی میں "آل انڈیا احرار تبلیغ کانفرنس" کے اجلاس منعقد ہوئے لیکن مسلمانوں کو کچھ دلچسپی ہی نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کہاں ہو رہا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح ہندوؤں میں مختلف جماعتیں موجود ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے انداز میں اپنی قوم کی بہبودی کا کام کر رہی ہے اسی طرح اگر مسلمانوں میں بھی مختلف جماعتیں ہیں تو کیا حرج ہے۔ یہ حضرات ایک بنیادی فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں یا ہندوستان کی متحدہ قومیت میں

ایک اقلیت ہیں۔ مسلم لیگ کا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور اس قوم کی ترجمان لیگ ہے جس طرح ہندوؤں کی نمائندہ کانگرس ہے۔ اس لئے آج ہر وہ مسلمان جو اپنے جداگانہ تشخص کا مدعی ہو، اسے لیگ سے وابستگی ضروری ہے۔ لیگ کے علاوہ ملک کی دوسری (مسلمانوں کی) سیاسی جماعتیں اس اصول سے اختلاف رکھتی ہیں۔ اور یہی اختلاف ہے جس کی وجہ سے ہندو انھیں ایک اہم "جماعت" کی حیثیت سے مشہور کئے جا رہا ہے اس لئے کہ ان جماعتوں کا وجود ہندوؤں کے نزدیک ان کے دعوے "متحدہ قومیت" کی دلیل ہے۔ لہٰذا آج کوئی ایسی جماعت جو اس اصول میں لیگ سے اختلاف رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس لئے اس کا وجود جتنی جلدی مٹ جائے ملتِ اسلامیہ کے لئے اتنا ہی اچھا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں اپنی جداگانہ قومیت کے تسلیم کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے یہ پہلے ہی منوا رکھا ہے کہ ہندو باوصف ان ہزاروں اختلافات کے جو عقائد و معاشرت کی دنیا میں ان میں موجود ہیں ایک قوم ہیں۔ اس لئے ان کی مختلف جماعتوں میں اصول کا اختلاف نہیں۔ طریق کار کا اختلاف ہے۔ لیکن ہم اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں مسلمانوں میں ردج اسلامی کے پیشِ نظر ایک سے زیادہ جماعتوں کا وجود ہی غیر اسلامی ہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت اور ان کا ایک ہی امام ہو سکتا ہے۔ تحزب و تشیع۔ فرقے اور گروہ یکسر غیر اسلامی تصورات زندگی کی پیداوار ہیں۔ اس لئے اس جاہلیت کی زندگی سے جس قدر جلد اسلامی زندگی کی طرف لوٹا جائے۔ اتنا ہی اچھا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے دن سے کہتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے نزدیک اسلامی شعار صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ہو۔ اس جماعت کے مختلف شعبے مختلف کام اپنے ذمے لیں۔ معاشی۔ معاشرتی۔ تعلیمی۔ ذہنی۔ قلبی۔ اصلاح اپنی مختلف شعبوں کے ذمہ ہو اور ان سب کا ماحصل اسلامی ماحول اور مومنانہ زندگی اس دنیا میں سرفرازی و سربلندی کی زندگی اور عاقبت میں بھی سرخروئی اور فلاح و فوز کی زندگی۔ اس لئے مسلمانوں میں مختلف جماعتوں کا وجود جتنی جلدی مٹ کر "ایک" میں گم ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

(ایسے مواقع پر جب کوئی اہم واقعہ مہینہ کی آخری تاریخوں میں سامنے آجائے طلوع اسلام کے لئے بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ واقعات کی اہمیت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان پر اظہار خیال اسی اشاعت میں کیا جائے۔ کیونکہ آئندہ اشاعت میں ایک مہینہ کا وقفہ پڑ جاتا ہے اور دنیا جس برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے اس کے پیش نظر ایک مہینہ میں حالات کہاں سے کہاں جا پہنچتے ہیں لیکن انتظامی امور کا تقاضا ہوتا ہے کہ کاپیاں جلد از جلد پریس میں بھیجی جائیں تاکہ اشاعت بروقت ہو سکے۔ ان حالات کے ماتحت مجبوراً یہی کرنا پڑتا ہے کہ جوں جوں واقعات سامنے آتے جائیں ان پر ساتھ کے ساتھ تبصرہ کر کے مسودہ کاتب کے حوالہ کرتے چلے جائیں اس وقت ہمارے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ پہلی کاپیاں لکھی جا چکی ہیں کہ آج مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی ۲۹ اگست کی کارروائی اخبارات میں سامنے آئی ہے۔ ابھی مجلس کا اجلاس ایک دو دن اور بھی ہوتا رہے گا۔ ہم کوشش کریں گے کہ مجلس کے فیصلہ کے متعلق اسی اشاعت میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم)

مسلم لیگ کے اس سہ سالہ دور حیات میں ایسا نازک اور اہم مقام شاید ہی اس سے پیشتر آیا ہو اجلاس لاہور سنہ ۱۹۴۰ء جو بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے کم اہم نہ تھا لیکن نظم و ضبط کے قیام کے لئے موجودہ مرحلہ سب سے زیادہ دشوار گذار ہے اس لئے سارے ملک کی آنکھیں بمبئی کی طرف لگ رہی ہیں مسلمانوں کی اس لئے کہ ان کے ملی وقار کا سوال درپیش ہے۔ غیر مسلموں کی اس لئے کہ وہ فطری طور پر خوش ہیں کہ مسلمانوں میں تفرقہ انگیزی ہو۔ حکومت کی اس لئے کہ اس نے صدر مسلم لیگ کے علی الرغم وار کونسل اور ڈیفنس کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کا جو ڈھونگ رچایا تھا وہ بے نقاب ہوا جاتا ہے۔ ہم نے جناب جناح کی خدا داد تدبر اور فراست کا جو مظاہرہ سنہ ۱۹۴۰ء کے سالانہ اجلاس (لاہور) کے موقعہ پر دیکھا تھا اس کے پیش نظر ہمیں یقین ہے کہ وہ اس نازک مرحلہ کو بھی بحسن و خوبی طے کریں گے۔ یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے اس نازک وقت میں مسلمانوں کو جناح ایسا لیڈر عطا فرما رکھا ہے۔

۲۴ اگست کی روئداد ہمارے سامنے ہے اجلاس شروع ہوا۔ وزراء حضرات نے اپنی مدافعت میں وہی پرانی دلیل پیش کی کہ انھیں مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ بہ اعتبار وزیر اعظم منتخب کیا گیا ہے اس پر گرماگرم بحث ہوئی۔ موافق و مخالف دلائل پیش کئے گئے حامی اور مخالف گروہ اپنے دعوے کے اثبات میں اور بھی گرم جوش ہوئے وزراء صاحبان نے سمجھ لیا ہوگا کہ میدان مار لیا۔ جناح سب کچھ خاموشی سے سنتے رہے۔ جب گرمیٔ بحث انتہا تک پہنچ چکی تو وہ اپنے روائتی وقار اور معنی خیز تبسم کے ساتھ اٹھے اور فرمایا کہ وزراء حضرات کا جواب دعویٰ یہ ہے کہ انھیں مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ وزیر اعظم کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان کے لئے سوائے اس کے چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اس نامزدگی کو قبول کر لیتے۔ یہ ہے مدافعت کی سب سے بڑی دلیل۔ لیکن ایک شہادت میرے پاس بھی ہے اسے بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ یہ کہا اور جناب وائسرائے کی ایک چٹھی نکالی جس میں لکھا تھا،

"وائسرائے صاحب یہ نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ نیشنل ڈیفنس کونسل میں مسلمانوں کی ملت عظمیٰ کی نمائندگی ایسے اشخاص کے ذریعے ہو جو شہرت اور قابلیت میں ممتاز ہوں چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر انھوں نے پنجاب بنگال آسام اور سندھ کے وزیر اعظموں کو اس کونسل کی رکنیت کی دعوت دی اور ان کے علاوہ دیگر مشہور مسلمانوں کو بھی دعوت دی مثلاً سر محمد عثمان" (ہندوستان ٹائمز ۲۵ اگست ۴۲ء)

سوسنار کی اور ایک لہار کی۔ ایسے ہی مواقع پر کہتے ہیں۔ ذرا تصور میں لائیے کہ اس پر ان حضرات پر کیا گذری ہوگی جنھوں نے ہفتہ بھر سے ملک میں ایک کہرام مچا رکھا تھا کہ ہمارے خلاف ناحق زیادتی کی جا رہی ہے اکا ڈو تو ہو نہیں سکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے بڑی سزا دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتی بشرطیکہ کسی کے سینہ میں حساس قلب اور گردن پر خوددار سر ہو۔ خدا شاہد ہے ہمیں اپنے کسی بھائی کی ذلت و رسوائی پر کبھی خوشی نہیں ہوتی ہم تو ملت اسلامیہ کے ادنیٰ سے ادنیٰ فرد کو بھی سربلند دیکھنا چاہتے ہیں لیکن فطرت کی تعزیریں بڑی سخت ہوتی ہیں ایسے مقام پر ہماری ہمیشہ یہی دعا ہوتی ہے کہ خدا کرے یہ تازیانہ ہمارے ان راہ گم کردہ بھائیوں کے لئے عبرت کا موجب بن جائے کہتے ہیں کہ اس پر سر سکندر حیات خاں صاحب اٹھے اور انھوں نے کہا کہ

"میں یہاں ایک ملزم کی حیثیت میں اپنی صفائی پیش کرنے کیلئے نہیں ہوں بلکہ آپکو اپنے قائدِاعظم کے رحم پر چھوڑنے اور ان کے فیصلہ کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے پر آمادہ ہوں خواہ وہ فیصلہ غلط ہو یا صحیح۔" (ہندوستان ٹائمز ۲۵)

"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!" ۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں لکھنا چاہتے اسلئے کہ اگر یہ جھکنا ویسا ہی ہے جیسا اس سے پیشتر کئی مرتبہ دیکھا جا چکا ہے تو اس سے "فریب گر تو اول خوردہ بودم یاد می آید"۔

اور اگر یہ فی الواقعہ ایک جھکے ہوئے قلب کا ارتعاش ہے تو اس کے سامنے ہر ایک کی نگاہیں جھک جانی چاہئیں جی یہ چاہتا ہے کہ کاش یہ جھکنا پہلے ہی ہوتا۔

جناب وائسرائے کی جس چٹھی کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے اسکے جواب میں جناب جناح نے جو کچھ لکھا وہ یقیناً اس قابل ہے کہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ کر لیا جائے دیکھئے کہ جس مردِ دانا و بینا کے ہاتھ میں آپکی زمامِ سیاست ہے اللہ تعالیٰ نے اسکو کسقدر روشن دماغ اور جوشِ دل عطا فرمایا ہے۔ بہ خطوط جواب میں لکھا

"کیا یہ چیز کسی جماعت کے کسی مشہور اور قابل فرد کے لئے باعثِ فخر کہلائی جا سکیگی کہ وہ کسی ایسی دعوت کو قبول کرے جو اسکی جماعت کی پوزیشن اور روش کے خلاف ہو اور کیا یہ چیز گورنمنٹ کیلئے وجہِ افتخار ہوگی اگر وہ کسی ایسے فرد کے پھسلانے میں کامیاب ہو جائے اور اس طرح اس جماعت میں انتشار پیدا کرے اس امید پر کہ وائسرائے صاحب کی دعوت کو قبول کرنیکے لئے وہ اپنی جماعت کے آئین و نظم و شعار کو توڑ ڈالے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کی ملتِ عظیم کی نمائندگی صرف مسلم لیگ کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اس آپ میں حکومت کی ضد حالات میں بہتری نہیں پیدا کریگی بلکہ اسکے برعکس مسلم لیگ کیطرف سے تلخی پیدا کرنیکا موجب ہوگی جس کا اتفاق سے اس وقت تک موجود نہیں ہے۔"

حق گوئی و بیباکی آئینِ جوانمرداں اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

---

۲۹ اگست کے اخبارات میں (۲۸ اگست کی) مزید روئداد آگئی جس سے معلوم ہوا کہ سر سکندر حیات خانصاحب اور سر محمد سعد اللہ صاحب نے ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر دیا ہے اس لئے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ فالحمد للہ علی ذلک

جناب جناح کا اخلاص۔ دیانت۔ خودداری۔ صداقتِ مقصد۔ اولوالعزمی۔ اعتماد۔ رنگ لایا۔ بھلا سوچئے کہ وہ کونسا خوفناک خطرہ تھا جس سے انہیں ڈرایا نہیں گیا تھا اور وہ کونسی مہذب دھمکی تھی جو انہیں دی نہیں گئی تھی؟ لیکن صد آفریں اس مردِ دانا کی ہمت و استقلال پر کہ مخالفت کے اس ہجوم میں ان کے عزم میں ذرا لغزش نہ آئی۔ جناب جناح نے آج لیگ کے وقار کو دنیا کی نگاہوں میں بلند کر دیا۔ لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اس فیصلہ نے ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کی عظمت بڑھا دی اور وزراء حضرات نے اس فیصلہ سے اپنے آپکو افسوسناک عواقب اور قوم کو تفرقہ کی لعنت سے بچا لیا۔ "حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زنند"

بہرحال مبارک ہیں وہ جنھوں نے اپنے عزم و استقلال سے ملت کی عظمت کو یوں قائم رکھا اور مبارک ہیں وہ جو جماعت کے فیصلہ کے سامنے اس طرح جھک گئے اللہ تعالیٰ ان کی اس اطاعت شعاری کی روش میں استقامت عطا فرمائے۔ قوموں کی زندگی اسی انداز سے قائم رہا کرتی ہے۔

افسوس ہے کہ جناب فضل الحق صاحب نے اپنی جذباتی نا عاقبت اندیشی سے اپنے وقار کو خاک میں ملا دیا۔ جب جماعت نے متفقہ طور پر ایک فیصلہ دے دیا تو اس کے بعد پھر سوچ بچار کیا؟ سمعنا و اطعنا (سنا اور جھک گئے) یہ ہے ایک حب مسلم کا شعار زندگی۔ اگر جناب فضل الحق صاحب یہی شعار اختیار کرتے تو اس سے ان کی عظمت بھی بلند ہو جاتی اور قوم مزید تذبذب سے بچ جاتی۔ بہرحال ان سے اس فیصلہ میں بڑی غلطی ہوئی ہے اور اس کی تلافی اسی طریق سے ہو سکتی ہے کہ وہ مزید توقف کے بغیر دوسرے وزراء کی طرح ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔

جناب فضل الحق صاحب کی طرح سر سلطان احمد، نواب صاحب چھتاری اور بیگم شاہ نواز کو بھی دس دن کی مہلت دی گئی ہے کہ وہ اس دوران میں استعفیٰ دیدیں۔ خدا کرے کہ ان کی سمجھ میں بھی یہ بات آجائے کہ حقیقی عزت اور وقار جماعت کا ساتھ دینے میں ہے۔ بہرحال اگر یہ لوگ جماعت کے فیصلے کے سامنے جھک جائیں تو اس میں انہی کی بڑائی ہے۔ لیگ اب خدا کے احسان سے اس مقام تک پہنچ چکی ہے کہ کسی کی شمولیت یا علیحدگی اس کی ہستی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو! جماعتیں درحقیقت وہی زندہ رہا کرتی ہیں جو شخصیتوں کے اثرات سے بے نیاز ہو جائیں۔ لیگ میں اب زندگی آچکی ہے اور اس زندگی کی وجہ یہ ہے کہ وہ حق پر ہے۔ یہ لوگ اب ڈیفنس کونسل یا اگزیکیٹو کونسل سے الگ ہو جائیں یا ساتھ رہیں اس سے اس مسئلہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا یہ مسئلہ دراصل مسلمانوں کی ملی جماعت اور حکومت کے درمیان ایک جنگ تھی۔ لیگ کا دعویٰ تھا کہ جب تک حکومت اس کے مطالبات کو پورا نہیں کرتی وہ ان معاملات میں حکومت سے تعاون نہیں کر سکتی حکومت کی تدبیر یہ تھی کہ لیگ کو پس پشت ڈال کر بالا ہی بالا مسلمانوں کے سربرآوردہ حضرات کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ لیگ کے مجلس عاملہ کے فیصلہ نے حکومت کی اس تدبیر کو باطل کر کے رکھ دیا اور ایک دنیا نے دیکھ لیا کہ لیگ کی تائید کے بغیر

حکومت میں مسلمانوں کی نمائندگی ناممکن ہے۔ یہ ایک فتح مبین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس بظاہر کمزور اور بے سروساماں جماعت کو عطا فرمائی ہے اب باقی حضرات کے انحرافی فیصلے اس فتح کو شکست سے نہیں بدل سکتے۔

اس ساری کشاکش میں سب سے دلچسپ ٹکڑا یہ ہے کہ جناب وائسرائے اور وزیر ہند کی آپس میں کیا گذری ہوگی! وزیر ہند صاحب نے کس جزم و یقین کے ساتھ ۱۹ اگست کو اعلان کیا تھا کہ ان حضرات کی شرکت مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ بہ اعتبار وزیر اعظم ہے انہیں کیا معلوم کہ ان کے مد مقابل بھی ایک نحیف و ضعیف انسان کے جیب میں وہ میگزین رکھا ہے جو چار ہی دن کے بعد اس دعوے کی دھجیاں فضائے سیاست میں بکھیر دے گا اور پھر جناب جناح کی "وکالت" پر بھی ہزار آفرین کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اس الجھے ہوئے مقدمہ کو کس حسن و خوبی سے سلجھایا کہ ساری دنیا نے حقیقت کو برملا دیکھ لیا خلوص اور صداقت کے ساتھ تدبر اور فراست دنیا میں یہی کچھ کر کے دکھایا کرتی ہے! ساری دنیا ان کے تدبر کا لوہا مانتی ہے لیکن یہاں ہمارے "قومیت پرست" علمائے کرام ہیں کہ ان کی نگاہوں میں کچھ جچتا ہی نہیں اس لئے کہ یہ چیزیں ان بیچاروں کی دنیا سے باہر کی ہیں وہ ان بلندیوں کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے مشہور ترکی جرنیل۔ عثمان پاشا (شیر پلونا) ایسے جلیل القدر اور آزمودہ کار جرنیل تھے کہ سارا یورپ ان کا معترف تھا لیکن ان کا سائیس کہا کرتا تھا کہ میں نہیں سمجھ سکا کہ لوگ اس آدمی کو اتنا بڑا کیوں سمجھتے ہیں! اسے تو زین کا کلس بھی لگانا نہیں آتا! اب اس بیچارے کو کس طرح سمجھایا جائے کہ دنیا عثمان پاشا کو کیوں اتنا بڑا جرنیل مانتی تھی سو اپنی اپنی دنیا ہے جس کے نزدیک ایک ساری عظمت کا راز کلس لگانے میں مضمر ہو وہ کیا جانے کہ میدان کارزار میں جراُت و جسارت اور تدبیر و فراست بھی وجہ تحسین ہو سکتی ہے! ان چیزوں کے لئے نگاہ کی ضرورت ہے اگر ہمارے ان "قومیت پرست علما" کو بھی نگہ بصیرت عطا ہو جاتی تو یہ پھر دیکھ سکتے کہ جناح کن بلندیوں پر ہے۔

کیا جانے کیا کہتا، کیا دیکھتا، کیا کرتا … زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

اس مقام پر ہم چند الفاظ مسلم لیگ سے کہنے بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اسمیں شبہ نہیں کہ جناب جناح میں خلوص بھی ہے

صداقت بھی، تدبر بھی ہے سیاست بھی، ایثار بھی ہے قربانی بھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اکیلے جناح بیچارے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ کیا ان کے علاوہ باقی حضرات پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے کہ باقی حضرات میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو علیٰ حد وسعت اپنی خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن صاف بفرمائید۔ لیگ میں اکثریت انہی کی ہے جنہوں نے سمجھ یہ رکھا ہے کہ ہمارا فریضہ فقط لیگ میں شمولیت ہے۔ کام کرنے کے لئے اور لوگ ہیں! یہ غلط ہے اس طرح سے کام نہیں چل سکتا۔ ان حضرات کے نزدیک کام فقط اتنا ہی ہے کہ کبھی کبھار اس قسم کی ہنگامہ آرائی اور جوشش آفرینی کے مظاہرے کر دیئے۔ تکبیر کے فلک بوس نعروں میں ریزولیوشن پاس کر دیئے اور اس کے بعد نہایت اطمینان سے گھروں میں بیٹھ رہے جب پھر دیکھا کہ فضا میں کچھ سکوت پیدا ہو رہا ہے تو پھر اس قسم کے ارتعاشں کے سامان پیدا کر دیئے۔ بھلا کہیے کہ اس سے کبھی حصولِ مقصد ہو سکتا ہے آپ نے ساری دنیا سے جنگ مول لے رکھی ہے اور اپنی یہ حالت ہے کہ ریزولیوشن پاس کرنے کے بعد چادر تان کر سو جاتے ہیں آپ کا ریزولیوشن آپ پر تو فقط اتنا ہی اثر کرتا ہے لیکن آپ کی مخالف قوتوں کو جھنجوڑ کر بیدار کر دیتا ہے۔ آپ نے سنہ ۱۹۴۰ء میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس کیا آپ تو ریزولیوشن پاس کر کے گھروں کو چل دیئے اور مخالف قوتوں نے اس دوران میں مخالفت کی ایک نئی دنیا تیار کر ڈالی جائزہ لیجئے کہ آپ نے اس اثنا میں کیا کیا اور مخالف قوتوں نے کیا سے کیا کر ڈالا۔

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

آپ نے مسلمانوں کی تعلیمی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ معاشرتی اصلاح کے لئے اسکیمیں مرتب کیں اور ان کے ترتیب دینے کے بعد کاغذات کو سنبھال کر رکھ لیا کہ اب ان "تعویذوں" کے اثر سے سب کچھ خود بخود ہو جائے گا!

تمہیں کہہ دو کہ یہ بھی کچھ باتیں ہیں،

ذرا سوچئے تو سہی کہ دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے اور آپ ہیں کہ

وہی لنگوٹا ہے وہی اپنا سر ہے

ہندوستان کے حالات پر نگاہ ڈالئے، بین الاقوامی مسائل کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا یہ چاروں طرف کی آگ بھی آپ کو آمادۂ عمل کرنے کیلئے کافی نہیں؟ یہ تو وہ حالات ہیں کہ ان سے ایک مفلوج کی رگوں میں بھی خونِ زندگی دوڑ اٹھے!

دُنیا میں ہر مقام پر خطرہ محسوس ہو رہا ہے، صرف محسوس ہی نہیں ہو رہا۔ بلکہ آنکھوں کے سامنے کھڑا ہے لیکن حیرت ہے کہ آپ کو اتنا بڑا خطرہ بھی بیدار نہیں کر سکتا؟ اور اگر آپ ان تمام دھماکوں کے باوجود بیدار نہیں ہونا چاہتے تو فطرت کے قوانین اٹل اور اس کے فیصلے محکم ہیں۔ محض مقدس آرزوئیں زندگی کی ضامن نہیں ہو سکتیں۔ مقصد کی پاکیزگی نہایت ضروری ہے، لیکن اس کے حصول کے لئے ان تھک کوششیں، غیر منقطع جد و جہد اور سرفروشانہ سعی و عمل بھی لابدّ ہے۔ عام حالات میں تھوڑی بہت کوشش بھی کام کر جاتی ہے، لیکن جن حالات سے اس وقت سامنا نظر آتا ہے، ان کے لئے تو انتہائی کوشش کی ضرورت ہے۔ ہم میں ان لوگوں کی کمی نہیں ہے، جو فکر معاش سے آزاد ہیں، اور اپنا پورا وقت قوم کے لئے وقف کر سکتے ہیں۔ وہ ذرا سوچیں اور گریبان میں منہ ڈالکر دیکھیں کہ انہوں نے کس حد تک اپنے فرائض کی تکمیل کی ہے؟ یاد رہے کہ جو قدم آپ نظاہر قوم کے لئے (یعنی "دوسروں" کے لئے) اٹھاتے ہیں، وہ بھی درحقیقت خود آپ کے اپنے لئے ہوتا ہے اس لئے کہ سیلاب کو روکنے کیلئے گاؤں کے باہر بند بنانے والا گاؤں ہی کی حفاظت نہیں کرتا، بلکہ خود اپنی حفاظت بھی کرتا ہے، اس لئے کہ جب طوفان اُمنڈ تا ہے تو وہ مکانوں کے سائن بورڈ دیکھکر اندر داخل نہیں ہوتا ؎

سیلاب نہ پُرسد کہ در خانہ کدام است

اس کی رو میں امیر کا قصرِ مزین بھی اُسی تشبک سیری سے بہہ جاتا ہے جس طرح ایک فقیر کی جھونپڑی۔ خُدا کسی ملک کو حوادث کی آماجگاہ نہ بنائے۔ اُس وقت کی کیفیت کا تو تصور بھی لرزہ انگیز ہے۔ حوادث کا ایک بڑی حد تک وہ قومیں مقابلہ کر سکتی ہیں۔ جن میں اتحاد و یگانگت ہو، باہمی ربط و ضبط اور اطاعت کا جذبہ ہو۔ قربانی کی رُوح اور دوسروں کی خاطر سینہ سپر ہو جانے کی ہمت ہو۔ ہر چند مسلمانوں کے لئے ان خصوصیات کی ضرورت پہلے بھی کچھ کم نہ تھی، لیکن اب تو وہ وقت آچکا ہے کہ اس میں ذرا سی غفلت افسوسناک عواقب پر منتج ہوجائیگی۔ ہماری خوش بختی ہے آج ہماری نیابت و وکالت ایک ایسے صاحب بصیرت کے ہاتھ میں ہے جس پر قاطبتہً اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ جناب جناح دولت کی کشش سے بہت بلند ہیں۔ سراب آسا عزّ و جاہ کے دام فریب میں نہیں آسکتے۔ صحیح سوچتے ہیں اور صحیح راہ عمل تجویز کر سکتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ ان پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہوئے ان کے ہاتھ مضبوط کر دیئے جائیں۔ صاحب دولت جس قدر امکان میں ہو اپنی دولت ان کے حوالہ کر دیں، قل العفو (جتنا ضرورت سے بچ جائے) ایسے ہی مواقع کے لئے آیا ہے، وہ اس سے آپ کی دولت کی حفاظت کا صحیح انتظام کرینگے، آپ اپنی حفاظت، اور اپنے مال و متاع کے تحفظ کے لئے پاسبان بھی تو متعین کرتے ہیں۔

ان پر بھی تو بالآخر کچھ نہ کچھ صرف آتا ہے یہ پاسبانی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہوگی۔ آپ کا دیا ہوا آپ ہی پر صرف کیا جائے گا اور نہایت عمدہ طریقہ سے صرف ہوگا۔ یہ سودا آپ کو مہنگا نہیں پڑے گا۔ یہ تجارت خسارہ کی نہیں نفع کی ہوگی، یاد رہے آپ کی انفرادی خیرات، انفرادی صدقات، انفرادی زکوٰۃ، غرضیکہ انفرادی انفاق کسی رنگ اور کسی شکل میں ہو۔ کبھی وہ نتائج پیدا نہیں کرسکتا۔ جو آپ چاہتے ہیں۔ اس سے نہ قوم کا افلاس دور ہو سکتا ہے، نہ بھوکوں کی گرسنگی جا سکتی ہے، نہ محتاجوں کی احتیاج رفع ہو سکتی ہے۔ سب روپیہ ضائع ہوتا ہے اور اس کا ماحصل اپنے نفس کے جھوٹے اطمینان کے سوائے اور کچھ نہیں ہوتا۔ ایک دلی ہی کو لیجئے لاکھوں روپے سالانہ کی خیرات عبث و بیکار جا رہی ہے۔ مخیر حضرات نہایت نیکی سے اپنی دانست میں نہایت موزوں مقامات پر بے بہا دولت صرف کر رہے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھئے تو اس کا کوئی اطمینان بخش نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ وہی بھوکے، وہی محتاج اتنے ہی خستہ حال، ویسے ہی لاچار۔ ہر سال سامنے آجاتے ہیں۔ سب سے بڑی مد دینیاتی مدارس پر صرف ہوتی ہے لاکھوں روپے کی جائیداد کے اوقاف اس "کار خیر" کے لئے مخصوص ہیں۔ لیکن ان مدرسوں کے نتائج کو عملی زندگی کے میزان میں رکھکر تولئے تو پر کاہ کی حیثیت بھی سامنے نہیں آتی۔ طلباء کی یہ کیفیت کہ خودداری، کاسۂ گدائی کے ہاتھوں فروخت۔ دو دو روپیہ کے وظائف اور محلہ کی روٹیوں پر گذران۔ وظائف کے لئے مہتمم صاحبان کی جا و بیجا خوشامد اور روٹی کے لئے ہر بڑی دہلیز پر جبیں سائی۔ یہ ہے وہ ماحول اور وہ نظام جن میں آپ کے آئمہ مساجد اور علماء کی جماعتیں تیار ہوتی ہیں۔ کہئے! ان میں اعتماد نفس اور خودداری کی کوئی رمق بھی پیدا ہو سکتی ہے! پھر تعلیم پر نگاہ ڈالئے تو نہ دین کے کام کی نہ دنیا کے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مدارس کا فارغ التحصیل طالب علم جب باہر دنیا میں جاتا ہے تو بالعموم اپنے آپ کو بجز اس کے اور کچھ نہیں پاتا کہ تختۂ مسجد نہ قابلِ سوختن نہ قابلِ فروختن۔ قیامت ہے کہ یہ مخیر حضرات خود بالعموم سوداگر ہیں۔ اگر ان اوقاف کی جائیداد سے یہ ایک کارخانہ ہی کھول لیں تو یہ تمام طلباء اس میں آدھا دن صنعت و حرفت کا کام کریں، اور باقی آدھا دن مدرسہ میں تعلیم حاصل کریں۔ انہی کی کمائی انہی پر صرف ہوتی جائے لیکن یہ کام انفرادی طور پر کرنے کے نہیں۔ اگر یہ حضرات یہی اوقاف اپنی ملی جماعت کے سپرد کردیں۔ تو پھر دیکھیے کہ ان میں سے کتنے کام نکل سکتے ہیں! ہم تو کہتے ہیں کہ اگر مثلاً دلی میں ایک مسجد فتحپوری کی آمدنی ہی قوم کے ہاتھوں میں آجائے تو آپ دیکھیے قوم کی حالت کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس سے پیشتر مسلمانوں کو "چندہ گردی" کا بڑا تلخ تجربہ ہے۔ لیکن جناب جناح کی ذات پر تو اس باب میں پورا پورا اعتماد

کیا جاسکتا ہے۔ ان سے کسی قسم کا دھوکا متصور نہیں ہو سکتا۔ پھر گھبراہٹ کیسی اور تذبذب کیوں؟

ہم آج دل کی انتہائی گہرائیوں سے ہر اس مسلمان سے اپیل کرتے ہیں جس کے پاس کچھ بھی دینے کے لئے ہے کہ وہ انفرادی طور پر کچھ صرف نہ کرے بلکہ جو کچھ بن پڑے جناب جناح کی خدمت میں پیش کردے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کی اتنی سی قربانی سے کس قدر تابناک نتائج سامنے آجاتے ہیں۔ وہ اس روپیہ کو کس مصرف میں لائیں گے آپ کو اس سے غرض نہیں۔ آپ کا فریضہ صرف اتنا ہے کہ جو کچھ ان کے ذہن میں ہے وہ روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے رُکا نہ رہے۔ آپ یہ کیجئے اور دیکھئے کہ وہ اللہ کے ہاں سے آپ کے لئے ایک ایک کے بدلے سات سات سو لاتے ہیں یا نہیں؟

کچھ معارف القرآن سے متعلق۔ جلد سازی میں بھی توقع سے زیادہ وقت لگ گیا ہے۔ اور اس طرح ٹائٹل کی تیاری میں بھی۔ بہرحال بلا جلد کتابیں مکمل ہو کر بفضل ایزدی ہمارے پاس پہنچ چکی ہیں۔ اور رسالہ کی روانگی کے بعد ان کی روانگی شروع کر دی جائے گی۔ مجلد کتابیں امید ہے کہ ایک ہفتہ تک آجائیں گی۔ اور ساتھ کے ساتھ بھیجی جائیں گی۔ انشاء اللہ العزیز سابقہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا۔ کہ بلا جلد کی قیمت فی نسخہ پانچ روپے۔ اور مجلد کی قیمت چھ روپے ہوگی۔ لیکن جلد ساز سے معاملہ طے کرنے پر معلوم ہوا کہ جس قسم کی جلد ہم چاہتے ہیں وہ اتنے میں نہیں بندھ سکتی۔ مجبوراً اس پر اضافہ کرنا پڑا۔ لہٰذا مجلد کی قیمت چھ روپے چار آنہ فی نسخہ ہوگی۔ آپ اس پر پابند نہیں ہیں کہ ضرور مجلد نسخہ ہی منگائیں آپ بلا جلد بھی منگا سکتے ہیں۔ جس کی قیمت وہی پانچ روپے ہوگی۔

قیمت کے علاوہ کتاب پر محصول ڈاک بھی صرف ہوگا۔ کتاب کا وزن (بلا جلد) ۲۰ چھٹانک اور مجلد ۲۴ چھٹانک ہے۔ بلا جلد پر محصول ڈاک ۳؍ آنہ اور مجلد پر ۱۵؍ آنہ صرف آئے گا۔ ۳؍ فیس رجسٹری اس کے علاوہ ہے یوں سمجھئے کہ بلا جلد [illegible] میں اور مجلد [illegible] میں بھیجی جائے گی۔ زیادہ نسخے بذریعہ ریل منگانے والوں کو ریل کا کرایہ اور تھوڑا سا پیکنگ کا خرچہ ادا کرنا ہوگا۔

جن حضرات نے ہمیں اس مد میں روپیہ بھیجا ہے۔ انہیں منی آرڈر کی رسیدیں پہنچ گئی ہونگی۔ ان کا روپیہ ہمارے پاس امانت میں رکھا ہے۔ وہ تفصیل بالا سے حساب دیکھ لیں۔ اور ہمیں مطلع فرمائیں کہ وہ بقایا پیسے کس طرح ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ہفتہ تک اطلاع کا انتظار کیا جائے گا۔ اس کے بعد بقایا کی وی۔پی کر

دی جائے گی۔ جن حضرات کے آرڈر موصول ہو چکے ہیں۔ انہیں تفصیل بالا کے اعتبار سے وی۔ پی بھیجے جائیں گے اگر آپ مجلد کے بجائے اب غیر مجلد کتاب منگانا چاہتے ہیں۔ تو ایک ہفتہ کے اندر اندر اطلاع فرما دیجئے۔

غیر مجلد کتاب کی سلائی نہیں کرائی گئی۔ اس لئے کہ اتنی ضخیم کتاب بغیر جلد کے تو نہیں رہ سکیگی جب آپ جلد بندھوائیں گے تو موجودہ سلائی کے سوراخ بڑے بدزیب دکھائی دیں گے۔

کتاب اس زمانہ میں چھپی جب کہ جنگ کی وجہ سے ہر چیز خوفناک طور سے گراں ہو رہی ہے۔ لیکن ہمیں اس کی بڑی خوشی ہے۔ کہ کتاب تیار ہو گئی۔ اور حقیقتِ منتظر لباس مجاز میں آ گئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

فرمائیے، اس کی اشاعت میں آپ ادارہ کی کس طرح مدد کریں گے۔ بشرطیکہ آپ اس کی اشاعت ضروری سمجھتے ہوں!

جلد کتاب کارڈ بورڈ کے بکس میں ہوگی۔

"رومی نیٹشے اور اقبال" والا مضمون بالاقساط شائع ہو رہا تھا۔ اشاعت رواں میں اس کی آخری قسط معہ استدراک شائع ہونی تھی۔ کاپیاں لکھی رکھی ہیں۔ لیکن مسلم لیگ کے اجلاس کی کارروائی نے اتنی جگہ گھیر لی ہے کہ مجبوراً اس مضمون کو روکنا پڑا۔ ہم قارئین سے معذرت چاہتے ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں آپ کی نظر سے گذرے گا۔

یا چناں کن یا چنیں!

یا مسلماں را مدہ فرماں کہ جاں بر کف بنہ　　یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں

یا چناں کن یا چنیں!

یا برہمن را بفرما نو خداوندے تراش　　یا خود اندر سینۂ زناریاں خلوت گزیں

یا چناں کن یا چنیں!

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک　　یا دگر ابلیس بہرِ امتحانِ عقل و دیں

یا چناں کن یا چنیں!

یا جہانے تازۂ یا امتحانے تازۂ　　می کنی تا چند با ما آنچہ کردی پیش ازیں

یا چناں کن یا چنیں!

فقر بخشی؟ با شکوہِ خسروِ پرویز بخش　　یا عطا فرما خرد با فطرتِ روح الامیں

یا چناں کن یا چنیں!

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب　　یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں

یا چناں کن یا چنیں!

اقبال علیہ الرحمۃ

لمحۂ فکریہ

یوں تو فرشتوں کی معصوم نگاہوں نے خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں، **آدم** کے خمیر میں ہی بھانپ لی تھیں۔ لیکن اس آگ اور خون کا مظاہرہ جس شدت اور بربریت سے آج ہو رہا ہے فرشتوں کی نگاہوں نے ایسا نظارہ اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ تاریخ کے اوراق نے **ہلاکو** اور **چنگیز** کے نام کو ہلاکت اور خونریزی سلب و نہب قتل و غارتگری کے لئے بطور ضرب المثل محفوظ رکھا۔ ذہن انسانی نے **نادر** کی یاد بطور ایک ظالم اور سفاک کے قائم کی۔ لیکن **ہلاکو** اور **چنگیز** کے سیلابِ فنا کی زد میں کتنی دنیا تھی؟ نادر کے قتل عام کا منظر زیادہ سے زیادہ کتنے انسانوں نے دیکھا؟ دورِ وحشت و بربریت کے ہلاکت اور بربادی کے ان خونچکاں مناظر کی یاد کو تازہ کرو۔ اور پھر ان کے سامنے دورِ حاضرہ کے مہذب و متمدن انسان کی خونابہ فشانی اور ہلاکت آفرینی کی داستانِ الم انگیز کو رکھو اور سوچو کہ خمیرِ آدم کے ان آتشیں اجزاء کے مظاہرہ کا اس سے شدید موقعہ انسانیت کی تاریخ میں کبھی پہلے بھی آیا تھا؟ پہلے بربادی اور ہلاکت ہوتی تھی تو کسی ایک قوم کی۔ اجڑتی اور تباہ ہوتی تھی تو کوئی ایک بستی مٹتی اور فنا ہوتی تھی تو کوئی ایک **حکومت** لیکن آج! سوچئے کہ دنیا کا کونسا گوشہ ہے جو خونِ ابنِ آدم سے لالہ زار نہیں؟ کونسا خطہ ہے جو جہنم کی اس آگ کی لپٹ میں نہیں آگیا؟ کونسی بستی ہے جو اس عالمگیر زلزلے کے دھماکے سے محفوظ ہے؟ کچھ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں کچھ گرتی چلی جا رہی ہیں جو اب تک بظاہر محفوظ ہیں۔ انہیں بھی اس پیکرِ اجل سیلِ آتش کا ہر وقت دھڑکا لگا ہوا ہے۔

بہت آگے گئے۔ باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

انسان کی بے بسی کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز مثال اور کیا ہوگی کہ جس شاخ پر بیٹھا ہے اسے اپنے ہاتھوں سے کاٹ رہا ہے۔ سمجھتا ہے کہ ہر لمحہ موت سے قریب ہوا چلا جا رہا ہوں۔ لیکن مجبوری کا یہ عالم کہ شاخ پر تبر برابر چلائے جا رہا ہے۔ "قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا" کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ ابلیس نے اپنا پورے کا پورا عفریتی لشکر پہاڑوں کے غاروں سے کھول دیا ہے۔ جو آتشیں کوڑوں کو ہاتھ میں لئے ٹڈی دل کی طرح انسانوں کی بستیوں پر ٹوٹ پڑا ہے وَمِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ اور انہیں انتہائی بے رحمی سے مسلتا، رگیدتا، کچلتا، روندتا، انگارے اچھالتا اور خون کے فوارے چھوڑتا۔ اپنے ازلی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کر رہا ہے۔ یورپ کو اس کے جرائم کی سزا ملنی ضروری تھی۔ اس نے خدا فراموشی اور خود پرستی کا ایسا غیر فطری نظام دنیا پر مسلط کیا۔ جس سے انسانیت کا گلا گھٹ گیا۔ اگر انسانوں کی عدالت میں ایک انسان کا گلا گھونٹنے والے کی سزا موت ہے تو میزانِ خداوندی میں انسانیت کا گلا گھونٹنے والوں کی پاداشِ عمل ہلاکت اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ پاداشِ عمل کہیں باہر سے نہیں آیا کرتی آتشبازی کی ہلاکت کا سامان تو خود اس کی دوکان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ خارجی اسباب میں سے فقط ایک فتیلہ کی ضرورت ہوتی ہے اور بس۔ یہ جنگ قوموں کی جنگ نہیں۔ ملکوں کی جنگ نہیں۔ بلکہ معاشی نظاموں کی جنگ ہے اور یہ معاشی نظام وہ ہیں جو یکسر غیر فطری بنیادوں پر انسان نے خود اپنے ہاتھوں سے وضع کئے ہیں۔ اقوام یورپ ان غیر فطری نظامہائے معیشت کے تشتوں کی حفاظت میں سب کچھ کھو دینے پر آمادہ ہیں اور ان کے وابستگانِ دامن ان کی تائید و معاونت میں سب کچھ قربان کر دینے پر تیار۔ باہمی منافست و مسابقت یہ وہ فتیلہ ہے جو ان آتشبازوں کی دکان میں گرا۔ اور انہی کی متاعِ زندگی کو ان کی ہلاکت کا سامان بنا گیا۔ گھر کے چراغ سے خانہ سوزی کی اس سے زیادہ عبرت انگیز مثال کم ہی مل سکیگی۔

جب سڑک پر دو آدمی جھگڑتے ہوں تو تیسرا آدمی آکر انہیں چھڑا دیتا ہے۔ جب دس آدمی کسی کے مکان پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے ہجوم کر آئیں تو پولیس اس کی حفاظت کر دیتی ہے۔ اور مفسدہ پردازوں کو ان کی سرکشی کی سزا دیتی ہے۔ لیکن سوچئے کہ جب پولیس کے سپاہی آپس میں کشت و خون پر اتر آئیں تو انہیں آکر کون چھڑائے۔ اور کون ان کی سرکشی کی سزا دلائے؟ اس سے آگے بڑھئے۔ جب دو قومیں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جائیں تو کوئی تیسری قوت جو ان سے زیادہ طاقتور ہو۔ درمیان میں آکر ان کی ثالثی کر سکتی ہے۔ لیکن جب تمام کی تمام قومیں ایک دوسرے سے الجھ جائیں تو ان میں

کون حکم بن سکتا ہے؟ یورپ کی آج یہی حالت ہو رہی ہے۔

رہیں نہ رند یہ زاہد کے بس کی بات نہیں ۔ تمام شہر ہے۔ دو چار دس کی بات نہیں

ان حالات میں اقوام وملل عالم میں حکم بننے کا فریضہ ایک قوم کے سپرد ہوا تھا جس کو اللہ نے اپنے قوانین فطرت کے ضابطہ کا وارث منتخب کیا تھا۔ لیکن انسانیت کی اس سے بڑھکر بدبختی اور کیا ہوگی کہ وہ مجسٹریٹ خود اپنی حفاظت اور بقا کے لئے ملزموں کے رحم وکرم کا محتاج ہوگیا۔ دنیا میں آج چالیس کروڑ مسلمان بستے ہیں لیکن آج کسی مقام کے مسلمان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے والوں میں صلح کرا سکے یا ملزموں کو ان کے جرائم کی سزا دے سکے۔ سو جس بستی کی پولیس اور عدالت کی بے بسی کا یہ عالم ہو، وہ بستی اگر درندوں کا بھٹ نہ بن جائے تو اور کیا ہو! یہ دنیا میں شُہَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" (تمام عالم انسان کے نگران) مقرر کئے گئے تھے۔ لیکن یہ دنیا کے نگران خود اپنی زندگی کے لئے دوسروں کی نگرانی کے محتاج ہوگئے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ایسے نکمے عمالِ حکومت کی کیا سزا ہوتی ہے؟ یقیناً وہ مجرموں کے تمام جرائم کے ذمہ دار قرار دیئے جاتے ہیں۔ اور مجرمین سے کہیں زیادہ سزا کے مستحق! اور آج مسلمانوں کو یہ سزا ایسی شکل میں مل رہی ہے کہ اس سے بڑھکر ذلت آمیز عذاب (عَذَابٌ مُّهِينٌ) شاید ہی کسی کے حصہ میں آیا ہو۔ یورپ کی قومیں لاکھ آغشتہ خاک وخون سہی لیکن اپنے معاملات میں دوسروں کی دست نگر تو نہیں ہیں۔ وہ بیشک آج جہنم میں کود رہی ہیں لیکن اپنے فیصلوں سے کود رہی ہیں۔ لیکن ذرا مسلمانوں کی دنیا پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ کیسا قبرستانی منظر دکھائی دیتا ہے؟ ہندوستان کو چھوڑ دو کہ یہاں کا مسلمان کس گنتی اور شمار میں ہے! انہیں دیکھو۔ جنہیں آزاد کہتے ہو! غور کرو کہ دنیا کی بساطِ سیاست پر ان کی رفتار کا کیا عالم ہے! کہیں کوئی دھماکا ہوا اور یہ بیچارے سہمے! نہ اپنی رائے ہے نہ اپنے فیصلے، نہ اپنوں کی نظروں میں کوئی منزلت۔ نہ دوسروں کی نگاہوں میں کوئی وقعت۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا ہو کہ

اب چھری صیاد نے لی اب قفس کا در کھلا

لے دے کے آپ کی نگہ تجسّس ترکی پر جا کر ٹکے گی۔ لیکن سچ پوچھو تو یورپ کے بے پناہ عفریتوں کے مقابلہ میں اس کی بھی کیا حیثیت ہے۔ خالی جغرافیائی پوزیشن (ہماری ہزار مقدس آرزوں کے باوجود) آب

مقاومت تو پیدا نہیں کر سکتی اسے اپنے تحفظ و بقا کے لئے بھی بالآخر کسی نہ کسی، دوسری قوت کی ہی پناہ لینی پڑیگی۔ اس لئے واقعہ یہی ہے کہ آج تمام عالم اسلامی خدا کے ذلت آمیز عذاب میں گرفتار ہے۔ ملا بیچارے سے قرآن چھنا تو اس کے ساتھ ہی امور عامہ میں تدبر بھی چھن گیا۔ اس عالمگیر قیامت کا علاج سوچنا تو درکنار اس بے بسی کا سمجھ لینا بھی اس کے بس کی بات نہیں اس نے "نجات" کے لئے نہایت آسان راستہ تلاش کر رکھا ہے ایک خاص قطع کا لباس خاص وضع کی تراش خراش۔ چند بے ذوق سجدے۔ کچھ بے روح رسوم و مظاہر نقلی آثار چڑیاؤں کی مناظرانہ بحثیں۔ کچھ خواب اور افسانے۔ اندھی تقلید کی لاٹھی اور عوام کی جہالت۔ یہ ہیں اس غریب کا متاع دنیا اور سرمایۂ آخرت۔ یہ ارباب شریعت تھے۔ اہل طریقت ان سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ وہ زندہ انسانوں کے بجائے مردوں کی دنیا سے اپنا دامن باندھے ہوئے ہیں۔ بھلا سوچئے! جس قوم کا زندہ۔ مردہ سے مدد کا طالب ہو۔ اس سے بڑھکر فریب خوردہ قوم بھی دنیا میں ہو سکتی ہے! جو "محسوس دنیا" کو تیاگ کر ایک "مثالی دنیا" کی تلاش میں بادہ پیمائی کر رہا ہو۔ اس سے بڑھ کر منزل سے دور بھی کوئی اور ہو سکتا ہے! سوچئے! اور ماتم کیجئے اپنی اس حالت پر مسلمان ایک مدت سے انہی خود ساختہ "خداؤں" کی پرستش میں لگا ہوا ہے۔ اور اس کا زندہ اور پائندہ حی و قیوم خدا اس سے منہ موڑے بیٹھا ہے۔ بایں ہمہ مسلمان سمجھ یہ رہا ہے کہ میں خدا کا سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہوں۔ دنیا ساری جہنم میں چلی جائیگی اور میں جنت کا واحد مالک قرار دیا جاؤنگا۔ جہنم کو دوسروں کا مقام بتاتا ہے۔ اور نہیں سوچتا کہ وہ خود جہنم میں کھڑا دعظ کہہ رہا ہے۔ چونکہ مسلمان نے اس تن آسانی کی موت کو ہی صحیح زندگی سمجھ رکھا ہے۔ اسلئے جب کبھی کوئی زندگی بخش پیغام اس کے سامنے آتا ہے یہ اس سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور چونکہ اس زندگی بخش پیام میں اسکے معبودان باطل کی موت کا راز بھی پنہاں ہوتا ہے اسلئے وہ مسلمانوں کو بھڑکاتے ہیں اور انہیں اس پیام دینے والے کے پیچھے لگا دیتے ہیں۔ ذرا تاریخ کے اوراق کو الٹو اور دیکھو کہ مسلمان نے جس وقت سے قرآن کو چھوڑا اس کے بعد کتنے مواقع آئے جب قرآن کے پیام حیات آور کو اسکے سامنے لانے کی کوشش کیگئی لیکن اس نے اس نور کو دیکھکر چمگاڈر کی طرح آنکھیں بند کر لیں۔ اور اسکے خود ساختہ معبودوں نے اس نور مبین کے خلاف کس شدت و دلولہ سے نبرد آزمائی کی۔ اور اس پر پردہ ڈالنے کی مساعیٔ نامشکور کو کن کن مقدس اصطلاحات کا رنگ

دیکر اسس "جہاد" کو خدمتِ دینی بنایا۔ اور یوں بظاہر دوسروں کو لیکن فی الحقیقت اپنے آپ کو کھلے ہوئے دھوکے میں رکھا۔ "وَمَا يَخْدَعُونَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا كَانُوا يَشْعُرُوْنَ" گذشتہ ادوار کو چھوڑیئے خود اپنے زمانہ میں دیکھئے مسلمان فاسق و فاجر ہیں بد سے بدتر آلائشوں میں ملوث ہیں عقائد و اعمال کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس پر کوئی نہ کوئی دھبہ نہ ہو۔ ان سب کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جو نہی کسی نے قرآن کو سامنے کیا۔ ہر عقیدہ کا مسلمان اس کی مخالفت کے "جہادِ عظیم" میں حصہ لینے کے لئے بڑھ کر نکل آیا۔ ہمارے سامنے ہندی مسلمانوں کو قرآن کے پیغام سے شناسا کرانے کے لئے دو جلیل القدر ہستیاں آگے بڑھیں۔ ایک حضرت علامہ اقبالؒ اور دوسرے علامہ مشرقی۔ ایک نے ذہنی دنیا کو اپیل کیا۔ دوسرے نے عملی دنیا کو حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے پیغام کے لئے شاعری کو ذریعہ قرار دیا اس لئے ملاّ کی سنگ باری سے بچ گئے۔ کفر کے فتوے تو ان پر بھی لگے۔ لیکن خیر انہیں یہ کہکر "بخشدیا گیا" کہ یہ ایک شاعر ہیں اور شاعر کی کوئی بات قابلِ گرفت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ عجمی تصوف نے اس سے بہت پہلے شاعر کو مرفوع القلم قرار دے رکھا تھا۔ جو بات آپ نثر میں لکھکر قابلِ سوختنی قرار پا جائیں۔ اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر شعر میں کہہ دیجئے۔ سب مزے سے لے کر دھرائیں گے۔ ہرچند حضرت علامہؒ بار بار اعلان کرتے رہے کہ میں شاعر نہیں ہوں۔ لیکن انہیں شعراء ہی کی صف میں رکھا گیا۔ اور اس لئے ان سے کچھ زیادہ مواخذہ نہیں ہوا۔ شاعری کے چولے نے اتنا فائدہ ضرور دیا لیکن اس کے ساتھ ہی نقصان یہ ہوا کہ جنہوں نے ان کے پیغام سے اثر قبول کیا انہوں نے بھی اس اثر کو "شاعری" تک ہی محدود رکھا۔ یعنی ذہنوں میں انقلاب ضرور ہوا۔ لیکن وہ انقلاب عملی پیکر اختیار نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ عقیدتمندانِ اقبالؒ کے اس وسیع حلقہ کے باوجود آج تک ان کی کوئی یادگار بھی قائم نہ ہو سکی حالانکہ یہی پیغام کسی زندہ قوم کے سامنے ہوتا تو وہ دنیا کا تختہ الٹ کر رکھدیتی۔ علاّمہ مشرقی نے قرآن کا پیغام نثر میں دیا۔ اس لئے مخالفت نکھکر سامنے آگئی۔ جس جوش و شدت سے مذکرہ کے خلاف "جہاد" کیا گیا ہے شاید ہی اس کی نظیر مل سکے۔ ہندوستان بھر میں (جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے) ایک علامہ اسلم جے راج پوری تھے جن کی قرآنی بصیرت نے اس جوہر کو پہچان کر اس کی تائید کی۔ ورنہ دو دو روپے ماہوار کے "آئمہ مساجد" سے لے کر بڑے بڑے "مفتیانِ عظام" تک ہر ایک اس مخالفت کے ہجوم میں شریک ہو کر جنت کا پروانہ حاصل

کرر ہا تھا! (اور یہ مخالفت آج تک جاری ہے) قوموں کی بدبختی ان کے ہاتھ پر لکھی.... نہیں ہوتی ۔ اعمال و افکار سے ظاہر ہوا کرتی ہے۔ اگر ہندی مسلمان اپنے عذاب کی مدت ختم کرنا چاہتا تو وہ علامہ مشرقی کی قدر کرتا اور اس کی قدر کرنے سے خود ہندی مسلمان قرآن کو ساری دنیا کے سامنے پیش کر سکتا۔ مشیت کے بھیدوں سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔ ورنہ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اگر اقبال اور مشرقی جیسی ہستیاں کسی آزاد ملک میں پیدا ہوتیں تو دنیا میں صحیح انقلاب پیدا ہو جاتا اور آج چاروں طرف سے ٹھکرایا ہوا انسان ایک "نئی دنیا" کی تلاش میں جو یوں مارا مارا پھر رہا ہے وہ "نئی دنیا" اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی۔ قرآن سے باہر امن و عافیت کی "نئی دنیا" کہاں مل سکتی ہے؟ ابلیس کے چیلنج کے مقابلہ میں آدم سے یہی کہا گیا تھا کہ اس کی طاغوتی قوتوں سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (جب ہماری طرف سے ہدایت آئے گی تو جو اس ہدایت کی اتباع کرے گا تو اس کے لئے کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔) دنیا آج خوف و حزن سے پناہ ڈھونڈھ رہی ہے اور یہ پناہ اسے کہیں نہیں مل رہی۔ اس لئے کہ قرآن اس کی نگاہوں کے سامنے نہیں قیامت ہے کہ مسلمانوں کی اتنی اتنی بڑی حکومتیں موجود ہیں لیکن قرآن کریم کی آواز کہیں سے بلند نہیں ہوتی۔ ان کے اخبارات کو دیکھئے ان کے مشاہیر کے افکار کا مطالعہ کیجئے ان کی سیاسی اور قانونی اور علمی اور معاشرتی مجالس و محافل کی رودادیں پڑھئے۔ ان کے ریڈیو پر کان لگا کر بیٹھ جایئے۔ سب کچھ ہوگا۔ لیکن نہیں ہوگا تو قرآن اور یہ اس لئے کہ اگر قرآن سامنے آ جائے تو پھر یہ انسانی حکومتیں باقی کہاں رہیں؟ ہم تو جب اپنی قوم کی بوالعجبیوں پر غور کرتے ہیں تو بے اختیار اندوہ و تاسف کی ہنسی آ جاتی ہے۔ ذرا سوچئے۔ بنی اُمیہ کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ انہوں نے خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا۔ یعنی حکومت۔ وراثت میں ملنے لگی۔ باپ کے بعد بیٹا تخت کا مالک قرار پا گیا۔ یقیناً یہ بہت بڑا جرم تھا۔ لیکن غور فرمایئے کہ اس وقت سے آج تک مسلمانوں کے ہر ملک ہر خطہ۔ ہر خاندان میں سلطنت کا وہی طریقہ نہیں چلا آ رہا؟ لیکن مسلمان ان اربابِ سلطنت کے خلاف ایک لفظ بھی زبان تک نہیں لاتا؟ یہی نہیں کہ مخالفت کا ایک لفظ زبان تک نہیں لاتا بلکہ ان کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے اولوالعزم علمائے کرام اور جلیل القدر مفتیانِ عظام ان بادشاہوں

کے درباروں میں مسندوں پر بیٹھے اور ان کی سلطنت میں منبروں پر جلوہ فرما انہیں ظل اللہ قرار دے رہے ہیں۔ ایدہ اللہ بنصرہٖ اور خلد اللہ ملکہٗ کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ابھی تک سلاطین کا نام جمعہ کے خطبوں میں سرِ منبر لیا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ سلاطین وہی تھے جنہیں سلطنت اپنے باپ دادا سے وراثتاً ملتی چلی آرہی تھی۔ الغائے خلافت کے وقت مسلمانوں نے کہرام مچا دیا کہ مصطفےٰ کمال نے ایک بہت بڑے "اسلامی رکن" کو منہدم کر دیا۔ لیکن کسی نے اتنا نہ سوچا کہ جس رکن کو وہ "اسلامی" کہہ رہے ہیں خود اسلام کے میزان میں اس کی حقیقت کیا ہے؟ آج بھی وہی حالت ہے۔ دنیا بھر کی مسلمانوں کی حکومتوں پر نگاہ ڈالو۔ (خواہ مکہ کی مقدس وادیوں میں ہو یا ہندوستان کی کسی ریاست میں) سلطنت اسی طرح وراثتاً منتقل ہوتی چلی آرہی ہے جس طرح بنی امیہ میں تھی۔ طرفہ تماشا یہ کہ بنی اُمیہ کو آج گردن زدنی قرار دیا جا رہا ہے۔ اور ان شاہانِ اسلام کے لئے ہر مدرسہ اور ہر خانقاہ سے خیر و برکت کی دعائیں پکاری جاتی ہیں! کبھی مسلمان کا خیال اس طرف نہیں جاتا کہ جس جرم کی پاداش میں بنی امیہ کشتنی قرار پاتے ہیں وہی جرم ان کے ہاں بھی ہو رہا ہے۔ جن کے نام اس تقدیس و احترام سے لئے جا رہے ہیں۔ مسلمان کا خیال اس طرف کیوں نہیں آتا؟ اس لئے کہ قرآن اس کے سامنے نہیں۔ یہ حکومتیں قرآنِ کریم کو سامنے نہیں آنے دیتیں کہ وہ جانتی ہیں کہ جاء الحق و زھق الباطل قرآن کا نور آیا اور ملوکیت کی ظلمت نابود ہوئی۔ ملا قرآن کو سامنے نہیں آنے دیتا کہ اس کی روشنی میں اس کی برہمنیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حکومت اور مُلا کا تو تعلق ہی کچھ برہمن اور کشتری کا سا ہو چکا ہے۔ حکومت ملا کی محافظ ہے کہ وہ اس کی حفظ و بقا کے لئے دعائیں مانگتا ہے۔ اور مُلا حکومت کا محافظ ہے کہ وہ اُس کی کفالت کی ذمہ دار ہے۔ باقی رہے اربابِ طریقت سو ان کا سارا دارومدار عجمیت پر ہے۔ قرآنِ کریم میں اس رہبانیت کی کہاں گنجائش؟ لہٰذا وہ کس طرح چاہیں کہ قرآن بے نقاب ہو جائے۔ ایک قرآن اور اس کے اوپر اتنے پردے۔ 'ظلمات بعضہا فوق بعض' (نور ۲۴/۴۰) اس لئے جہاں کہیں قرآن سے پردہ اٹھنے کی کوشش ہوتی ہے یہ تمام قوتیں یورش کر کے امنڈ آتی ہیں۔ (شیطان چاروں طرف سے حملے کرتا ہے ۷/۱۷) بڑی بڑی حکومتیں تو ایک طرف یہ چھوٹے چھوٹے امراء اور جاگیردار۔ رؤسا اور زمیندار بھی اسی مخالفت میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اس لئے کہ قرآن

کی روشنی میں ان کی یہ جاگیریں اور زمینداریاں کہاں باقی رہ سکتی ہیں؟ ایک ایک شخص کے قبضہ میں دس دس ہزار ایکڑ زمین! خدا کی زمین پر انسان کی ملکیت! خدا کی بادشاہت میں اس کی کہاں اجازت؟ ان رؤساء و امراء کی "خدمات دینی" کی تفاصیل دیکھئے! فلاں مدرسہ کو وظیفہ دے رہے ہیں۔ فلاں دارالافتاء کی کفالت کر رہے ہیں۔ فلاں عالم کی "خدمت" ہو رہی ہے۔ یہ ان کی پرورش کرتے ہیں۔ اور اس کے معاوضہ میں اُن کی طرف سے ان کی زمینداریوں اور جاگیروں کے جواز کے فتاویٰ ملتے رہتے ہیں۔ ذرا ان دینی مکاتب میں جا کر دیکھئے۔ ان علوم کی درس و تدریس ہو رہی ہے جن کو نہ دین سے کچھ علاقہ نہ دنیا سے کچھ واسطہ ایک ایک درجہ میں دس دس کتابیں ہوں گی۔ لیکن اس سارے نصاب میں قرآن کا نام یونہی "تبرکاً" رکھا ہوگا اور برکت حاصل کرنے کے لئے سورۂ بقرہ کی تفسیر پڑھا دیں گے۔ کسی فارغ التحصیل مولوی صاحب سے بات کیجئے۔ "دین" کے متعلق ہدیہ۔ نسفی۔ چلپی کے صفحات کے صفحات رٹے ہوئے سنا دیں گے لیکن قرآن کریم کے کسی حکم کا کوئی حوالہ یاد نہ ہوگا۔ "دنیا" کی طرف آیئے تو انہیں یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ خطۂ ارض پر براعظم کتنے ہیں۔ ادھر کسی رئیس زادہ سے ملئے تو انہیں شکاری کتوں کی بیسیوں قسمیں معلوم ہوں گی۔ لیکن نہ نماز آتی ہوگی نہ یہ معلوم ہوگا کہ آج کل وزیر ہند کون ہیں۔ اپنے علاقہ سے انتخاب میں کھڑے ہوں گے۔ اور اپنی رعایا کے ووٹوں سے "جمہور" کے نمائندے بن کر اسمبلی میں آجائیں گے۔ وہاں اگر اپنے جیسے پانچ سات کو ساتھ ملا لیا تو وزارت دھری ہے۔ اب ان سے یہ توقع رکھنا کہ سرفرازئ اسلام کے لئے کوئی اقدام کریں گے بے معنی خوش فہمی ہے یہ اسلام کے نمائندے تو ایک طرف۔ درحقیقت مسلمانوں کے نمائندے بھی نہیں کہلا سکتے۔ یوں نمائندہ بننے کو تو سر ظفر اللہ خاں صاحب بھی ان نو کروڑ مسلمانوں کے نمائندے بن سکتے ہیں جنہیں کافر اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھنا ان کے عقیدہ میں داخل ہے۔ لہٰذا قرآن کی آواز نہ آپ کے ان دینی اور علمی مراکز سے اُٹھ سکیگی۔ نہ کسی دنیاوی گوشہ سے جب آج مرکزِ اسلام مکہ معظمہ کی یہ حالت ہو کہ وہاں کی گلیوں میں کھلے بندوں انسانوں کی خرید و فروخت ہوتی ہو۔ تو قرآن کا نور اور کہاں سے دکھائی دیگا!

دینی مدارس کے متعلق کہدیا جائیگا کہ وہ ہمارے قدامت پرستی کے مظاہرے ہیں۔ لیکن ہماری

جدت پسند درسگاہوں کی حالت کونسی رنگ آور ہے۔ اینگلو مسلم ہائی اسکول، اسلامیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، کسی کو دیکھئے۔ اسلام اور مسلم کا نام اسی طرح تبرکاً لگا رکھا ہوگا جس طرح خط پر ۷۸۶ لکھدیتے ہیں نہ اسے نفسِ مضمون سے کوئی علاقہ، نہ اسے روحِ تعلیم سے کوئی تعلق۔ وجۂ جواز ان درسگاہوں کی فقط اتنی ہے کہ غیر مسلم درسگاہیں مسلمان طلباء کو اپنے ہاں داخل نہیں کرتیں۔ قوم کو بہلانے کی خاطر وہاں دینیات بھی داخلِ نصاب ہوگا۔ لیکن دینیات کی حدود طہارت کے مسائل سے آگے نہیں بڑھیں گی۔ اگر کہیں زمانے کے تقاضیات سے مجبور ہو کر اس نصاب میں تبدیلی بھی کی جائیگی تو وہ بھی نظری مسائل کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہ جائیگی وہ جنوں انگیز مستی کردار جو قرآنی تعلیم سے رگ و پے میں برقی تپاں بن کر دوڑ جاتی ہے۔ کہیں محسوس نہ ہوگی۔ قوم کے نوجوان، یا تو چلتی پھرتی لاشیں یا پھر یکسر آتشیں مخلوق۔ نہ اول الذکر میں زندگی کے آثار نہ مؤخر الذکر میں اطاعت کا شعار۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم نہ ان کے سامنے نہ ان کے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان حالات کے ماتحت ہمیں بالکل مایوس ہو جانا چاہئے؟ یہ تو غلط ہے۔ قرآن کریم تکمیلِ شرفِ انسانیت کا نصاب ہے۔ اس لئے جب تک دنیا میں انسان کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے اسے قرآن کی ضرورت رہیگی۔ اور جب تک، وہ انسانیت کے معراج تک نہیں پہونچتا قرآن کا فریضہ ادا نہیں ہوگا لہٰذا مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ جب ہم عام انسانوں سے مایوس نہیں تو مسلمانوں سے کیسے مایوس ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہم خود بھی کسی الگ مقام سے نہیں بول رہے۔ ہم بھی انہی مسلمانوں میں سے ہیں جن کی کیفیت گذشتہ اوراق میں بیان کی گئی ہے۔ مسلمان ہزار گئے گذرے سہی۔ لیکن ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہیں۔ یہ محض جذباتی خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔ غیر مسلم آئینِ خداوندی سے انکار، استہزاء اور سرکشی کا برتاؤ کرتا ہے لیکن مسلمان خواہ نام ہی کا مسلمان کیوں نہ ہو ایسی روش کبھی اختیار نہیں کر سکتا۔ ان لاکھوں میں ایک آدھ مستثنیات کو چھوڑ کر جن کی طرف سے استہزاء و سرکشی کے مظاہرے سامنے آجاتے ہیں، مسلمان سرکشی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ان میں سے اکثریت تو انکی ہے جو محض جہالت کی بنا پر روحِ اسلام سے دور ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جنہیں اتنی قوتِ ایمانی نہیں کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور مصالح و مقاصد کو آئینِ الٰہی

کے تابع رکھ سکیں۔ دانستہ سرکشی اور عمداً انکار و استہزار کی اصلاح نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جہالت یا کمزوری کی اصلاح کی جا سکتی ہے اسلئے آج بھی جبکہ دنیا فساد در فساد کا ہولناک منظر بن رہی ہے۔ ہماری امیدیں اس گئی گذری قوم سے وابستہ ہیں جو آج فی الواقعہ زندہ قوموں کی صف میں شمار کئے جانے کے قابل نہیں۔ اور اس سوختہ بخت قوم میں سے بھی بالخصوص ہندی مسلمانوں سے۔ یہ امر غالباً آپ کو بظاہر مضحکہ انگیز تضاد نظر آئیگا۔ لیکن یہ بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ دنیا کے باقی حصوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم ہیں۔ وہ حکومتیں اگرچہ غیر قرآنی خطوط پر متشکل ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی اپنی حکومتیں ہیں۔ اس لئے انہیں اس امر کا احساس بمشکل ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ برعکس اس کے ہندوستان کے مسلمانوں کو احساس ہو رہا ہے کہ وہ غیروں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہا ہے جو خدا کا عذاب ہے۔ اس لئے وہ موجودہ حالت پر مطمئن نہیں رہ سکتا۔ یہاں کے حالات ہر چند نامساعد ہیں۔ لیکن جو کچھ آج ساری دنیا میں ہو رہا ہے اس کے پیش نظر یہ معلوم کر لینا کچھ دشوار نہیں کہ فطرت ایک جہان نو کی تخلیق میں مصروف عمل ہے۔ دنیا نئے پیمانوں میں ڈھلنے کے لئے تیار ہو رہی ہے۔ موجودہ نقشے مٹ رہے ہیں۔ نئے نقوش ابھر رہے ہیں۔ چشم بصیرت دیکھ رہی ہے کہ اس کے بعد نہ یہ نظام زندگی رہیگا نہ یہ دنیا کی تقسیم رہیگی۔ یہ زمین بدل جائیگی۔.........

-------یہ آسمان بدل جائیگا (تبدل الارض غیر الارض والسمٰوات) اور اس جدید رتق و فتق میں ہندی مسلمان بھی اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں موجود پائیگا۔ اس تخریب و تعمیر کی ہمہمی میں ایک بڑا خطرہ یہاں کی تحریک قومیت پرستی سے تھا جو مسلمان کو مسلمان کی حیثیت سے باقی نہیں رہنے دینا چاہتی تھی۔ اس مشئوم تحریک سے اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو بچا لیا۔ اور (مسلم لیگ کی وکالت سے کہ ہم جناب جناح کو مسلمانوں کا بہترین وکیل سمجھتے ہیں۔) وہ خطرہ دور ہو گیا۔ اس لئے اب ہمیں امید ہو گئی ہے کہ دنیا جب اس بحران سے نکلیگی تو ہندی مسلمان داستان پارینہ نہیں بن چکا ہوگا۔ لیکن اس آنے والے وقت کے لئے مسلمان کو آج ہی سے تیار رہنا چاہئے اگر اس تشکیل جدید میں کہیں بنیادیں غیر قرآنی رکھدی گئیں تو پھر ثریا تک عمارت غلط رکھی چلی جائیگی۔ اور ہم ایک لعنت سے نکل کر دوسری لعنت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ جس میں باقی دنیا کے مسلمان گرفتار ہیں۔ یعنی قرآن کریم سے بُعد۔ اس کے لئے ضرورت صرف اتنی ہے کہ نوجوانوں کے

طبقہ میں قرآن پھیلا دیا جائے۔ اس کے لئے ہمیں موجودہ دینیاتی اور دنیاوی درسگاہوں سے کوئی توقع نہیں ان کی بنیادیں ہی غلط ہیں۔ اور غلط بنیادوں پر قرآن کی عمارت کبھی اٹھ نہیں سکتی۔ اس کے لئے تو ایک نئی طرح ڈالنی ہوگی۔ یہ آثار نیک ہیں کہ نوجوانوں کے طبقہ میں بتدریج قرآن کی طرف رجحان پیدا ہو رہا ہے لیکن جب تک قرآنی تعلیم کا صحیح نظام اور اس نظام کی عملی تشکیل سامنے نہ ہو یہ رجحان اپنے فطری نتائج پیدا نہیں کرسکتا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ رجحان بھی مدھم پڑ جائے۔ قرآن ایک عملی نظامِ حیات ہے۔ اور ذوقِ عمل کی لذت ہی وہ چاشنی ہے جس سے اس کی جاذبیتیں نکھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں ذوقِ عمل بھی ہے۔ لیکن چونکہ اس کا محرک جذبہ صحیح قرآنی تعلیم کا پیدا کردہ نہیں۔ اس لئے ان کا جوشِ کردار محض سطحی اور عارضی بن کر رہ جاتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان کے اس ذوق اور تڑپ کو ایمان کی صحیح بنیادوں پر استوار کر دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ جو کچھ سطورِ بالا میں گذارش کیا گیا ہے کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے! اگر اتفاق ہے تو فرمایئے اس کیلئے آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اور کیا کر سکتے ہیں! کیا آپ کے ذہن میں اس کے لئے کوئی عملی اسکیم بھی ہے! ہمارے سامنے تو چند چیزیں ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آپ اس میں کس قدر حصہ لے سکتے ہیں!۔

لیکن اگر آپ اپنی موجودہ حالت سے خوش۔ اور مستقبل سے بے نیاز ہیں، تو پھر آپ سے تخاطب ہی فضول ہے۔

نغمۂ شوق

غم کے دریا ہیں بہت عیش کے گلشن ہیں بہت
رہروِ شوق تری راہ میں رہزن ہیں بہت

عین پرواز میں بھی تو کہیں ساکن نہ رہے
کہ تخیل کے چمن میں بھی نشیمن ہیں بہت

خود فریبی سے کوئی بڑھ کے خطرناک نہیں
ہمنے مانا کہ رہِ دوست میں دشمن ہیں بہت

کون ایسا ہے جو صحرا کو کبھی آباد کرے
یوں تو عشاق بہ ہر کوچہ دبرزن ہیں بہت

قیدِ زنداں کا اسیروں کو کچھ احساس نہیں
خوش اسی پر ہیں کہ دیوار میں روزن ہیں بہت

اہلِ معنی کا چمکنا بھی ہے تاروں کی طرح
ظلمتِ شب ہے زیادہ تو یہ روشن ہیں بہت

مجھکو الفت کے مصائب سے ڈرانے والے
شکر ہے آپ تو آفات سے ایمن ہیں بہت

غم کی صورت ہے عیاں درد کی لذت ہے نہاں
اسلئے اہلِ خرد عشق سے بدظن ہیں بہت

خود تراشیں جو صنم ایسے تو کم ہیں لیکن
بت بنا کر کوئی رکھدے تو برہمن ہیں بہت

آ اسدؔ ہم بھی کسی خضر کو ممنون کریں
کہتے ہیں آج کل اس بھیس میں رہزن ہیں بہت

اسدؔ ملتانی

نظریۂ اضافیت

{ڈاکٹر جسٹس سر شاہ محمد سلیمان صاحب (مرحوم) ایک ایسی قابلِ قدر ہستی تھے جس پر علمی دنیا مدتوں تک ناز کرے گی۔ مشرقی اور مغربی علوم پر بلند پایۂ دست گاہ، اور اس کے ساتھ "مسلمان" بھی۔ حکیم این شٹائن کا نظریۂ اضافیت ایک ایسا بلند نظریہ ہے جسے کماحقہٗ سمجھنے والے دنیا میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان مرحوم نے نہ صرف یہ کہ اس نظریہ کو سمجھا بلکہ دلائل و براہین اور تجارب و شاہدات سے اسکی تردید کر کے علمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ یہ سب کچھ ہی ہوا لیکن تہی دست مسلمانوں کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ ان میں کتنا عظیم القدر گوہرِ گراں مایہ موجود ہے۔

شروع مارچ میں رامپور میں رضا اکادمی کے افتتاح کے لئے جناب ڈاکٹر سلیمان (مرحوم) نے ایک بلیغ خطبہ ارقام فرمایا تھا، وہ خود اچانک مرض الموت کی وجہ سے شریکِ جلسہ نہ ہو سکے لیکن یہ خطبہ جلسہ میں پڑھا گیا ۱۲ مارچ کو علمی دنیا کا یہ سورج غروب ہو گیا۔ یہ خطبہ ان کی آخری یادگار ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس قدر دقیق اور خشک مضمون کو کس قدر دلکش انداز میں ادا کیا گیا ہے۔ خطبہ کے آخری حصہ میں کچھ فنی پہلو ابھر آئے ہیں۔ ورنہ باقی جگہ تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم سے ایک سائنسدان یا ماہرِ ریاضی باتیں کر رہا ہو۔ خطبہ اتنا اہم ہے کہ ہم اسے طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ طلوعِ اسلام }

تمہیدی تعارف کے بعد آپ نے فرمایا :-

سب سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کل نظریے محض خیال آرائی پر مبنی ہوتے ہیں اور سچ پوچھے تو نظریے کے معنی ہی خیال آرائی کے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ یہ خیال آرائی حقائق معلومہ سے مطابقت رکھتی ہو۔ جب ایسے نئے حقائق دریافت ہوتے ہیں جن کی بنا پر پرانے مسلمہ نظریات قابلِ تسلیم نہیں رہتے۔ تو اہلِ نظر نئے نظریات قائم کرتے ہیں جو زیادہ سہل اور سادہ ہوں اور نئے دریافت کئے ہوئے حقائق سے مطابقت رکھتے ہوں،

نوعِ انسانی کی زندگی اس زمانے کے مقابلے میں جب سے کرۂ ارض وجود میں آیا، اس قدر مختصر ہے کہ کسی شمار میں بھی نہیں آتی اور خود کرۂ ارض کائنات کے اتھاہ سمندر میں ایک قطرے کے برابر بھی نہیں، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ یہ بے حقیقت انسان کائنات کی حقیقت کے بارے میں خیال آرائی سے کام لینے یا اندھیرے میں ٹٹولنے سے زیادہ اور کیا کرسکتا ہے۔ اس کی خیال آرائیاں پہلی بار لازمی طور پر غلط اور نامکمل ہوتی ہیں، لیکن جوں جوں اس کا تجربہ اس کی غلطیوں کو ظاہر کرتا جاتا ہے، وہ پرانے تصورات کو ترک کرکے نئے تصورات اختیار کرتا رہتا ہے، یہی عمل جاری رہتا ہے اور اس کو ہمیشہ جاری رہنا چاہیئے، اس لئے کہ کائنات کی حقیقت کبھی اس کے قابو میں نہیں آسکتی، یہی حال ان کوششوں کا ہے جو انسان کائنات کی اتھاہ گہرائی کو ناپنے کی کرتا ہے، جب سے گیلیلیو نے پہلی دوربین بنائی تھی، برابر زیادہ سے زیادہ طاقت کی دوربینیں بنتی چلی گئیں، مگر پھر بھی فضائے بسیط کی گہرائی اب تک نہیں ناپی جاسکی، اور نہ کبھی ناپی جاسکتی ہے۔ آلات کی مدد سے انسان کی نظر روز بروز فضا کی گہرائیوں میں گھستی چلی جاتی ہے، مگر اس کی تہ تک وہ کبھی نہیں پہنچ سکتا، اس لئے کہ یہ اس کی طاقت سے باہر ہے۔

باوجود اس حیرت انگیز ترقی کے انسان کا علم ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے، اس طویل زمانے میں جب کہ انسان نے عالم حیوانی میں ترقی کے بہت سے مدارج طے کئے ہیں، اس نے بتدریج معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کرلیا ہے، پھر بھی ہماری مثال ان بچوں کی سی ہے جو علم کے سمندر کے کنارے پر بیٹھے سنگریزے چن رہے ہوں، ہماری انتہائی لاعلمی فوراً ظاہر ہو جاتی ہے، جب ہم کائنات کی وسعت کا تصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر آپ اسے ملحوظ رکھیں کہ آفتاب اسی کھرب سال سے موجود ہے، اس زمین کی عمر جس پر کہ ہم بستے ہیں، دو ارب سال ہے اور زمین پر زندگی کے آثار نمایاں ہوئے تیس کروڑ سال گزر چکے ہیں، مگر اس کے مقابلے میں انسان کا وجود صرف تین لاکھ سال سے اور ذی عقل انسان کا صرف پندرہ بیس ہزار سال سے ہے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ چند ہزار سال کا زمانہ جس میں کہ انسان نے اپنی معلومات فراہم کی ہیں، اس طویل زمانہ کا ایک نہایت خفیف سا جزو ہے جو کہ کائنات کے اسرار کو معلوم کرنے کے لئے درکار ہے، ہماری عقل کو عاجزی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کی حدود لا انتہا اور اس کا دائرہ نامحدود ہے۔

ہمارے دائرۂ نظر کی تنگی! جس طرح ہماری نظر کا دائرہ محدود ہے، اور ہم ایک مخصوص جسامت سے چھوٹی چیزوں کا مشاہدہ نہیں کرسکتے اور ایک مخصوص فاصلے سے آگے اجسام کو نہیں دیکھ سکتے اسی طرح کائنات کے متعلق ہمارا علم بھی ایک تنگ دائرے میں

محدود ہے جس کے آگے یا پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ گزشتہ پچاس برس کی جد و جہد سے علمائے سائنس نے ایسے چھوٹے
چھوٹے ذروں کا انکشاف کیا ہے جو زمانہ ماقبل میں انسانی مشاہدہ سے باہر تھے۔ اب مادّے کو سالمات پر مشتمل سمجھا جاتا
ہے جو جوہر فرد سے مرکب ہیں۔ جوہر فرد کا ایک مرکز ہے جس کے اردگرد برق پارے حرکت کرتے رہتے ہیں۔ مرکز میں
ایک Neutron اور ایک Positron ہے جن کے متعلق ہم کم سے کم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ دونوں ایک
ہی نوعیت کے ہیں۔ ایک برقیہ جس کا قطر یعنی $\frac{1}{5 \times 10 \times 10 \times 10}$ پانچ ہزار کروڑواں حصہ ہوا اور جو اپنے مرکز کے چاروں طرف ایک
سکنڈ میں کروڑوں مرتبہ چکر کاٹتا ہو، اس کے تصور کی کوشش کرنا سعی لاحاصل ہے۔ اور پھر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ اندرونی عالموں
کی آخری حد ہے۔ ممکن ہے ان عالموں کے اندر ان سے بھی چھوٹے عالم ہوں۔ شاید ان میں سے بعض کا انسان آگے چل کر پتہ
چلائے، پھر بھی بہت سے ایسے ہوں گے جو ہمارے دائرۂ ادراک سے باہر رہیں گے اور غالباً ہم اب تک ان کی حقیقت کا پتہ
نہیں چلا سکیں گے۔

انسان کی کوتاہی آئیے ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیں۔ انسان اپنے گرد و پیش کی دنیا میں اپنے آپ کو ایک ناچیز سی مخلوق پاتا
ہے۔ یہ زمین جس پر کہ وہ سکونت پذیر ہے، ایک بہت بڑا کرہ ہے جس کا محیط تقریباً ۲۵ ہزار میل ہے۔ مگر پھر بھی اس آفتاب
سے جو ہمیں روشنی دیتا ہے کہیں چھوٹا ہے۔ آفتاب جسامت کے اعتبار سے زمین سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے۔ مگر ہمارا یہ عظیم الشان
آفتاب بھی ایک چھوٹے سے نقطے یا کائنات کے اتھاہ سمندر میں ایک قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تقریباً......۴۰×۱۰ (چار
کھرب) ستارے ایسے ہیں جو بجائے خود آفتاب ہیں۔ ان میں سے کچھ ہمارے آفتاب سے چھوٹے اور کچھ اس سے کئی گنا بڑے
ہیں۔ ان ہی سے ہمارا کہکشانی نظام بنتا ہے جس کی حدبندی کہکشاں کرتی ہے۔ روشنی کو ...۱۸۶ میل فی سکنڈ کی زبردست
رفتار سے آفتاب سے چل کر زمین تک پہنچنے میں ۸ منٹ لگتے ہیں۔ لیکن قریب ترین ستارے بھی اتنے دور ہیں کہ ان سے
روشنی کو زمین تک پہنچنے میں چند منٹ، چند گھنٹے، چند دن، چند ہفتے یا مہینے نہیں بلکہ ۴½ سال اور بعض حالتوں میں تو
اس سے بھی زیادہ عرصہ لگتا ہے۔ یہ تو قریب ترین ستاروں کا ذکر ہے۔ کہکشاں کا قطر اتنا بڑا ہے کہ روشنی کو باوجود اس شدید تیز
رفتاری کے اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں ...۲۲ سال لگ جاتے ہیں۔ اور ہمارے اس عظیم الشان
کہکشانی نظام کے اس طرف کروڑوں اور کہکشانی نظام ہیں جو کہ وِلسن کی سوراخ قطری دوربین کی مدد سے مشاہدے میں آئے
ہیں۔ ان سحابیوں کا فاصلہ ناقابل تصور ہے۔ ان میں سے بعض دور دراز سحابیوں سے روشنی کو باوجود اتنا تیز رفتار ہونے کے

زمین تک پہنچنے کے لئے چوبیس کروڑ سال چاہئیں امریکہ کے دولت مندوں کی دریا دلی سے اب دو سو انچ قطر کی دوربین بنانے کی نوبت آئی ہے یہ دنیا کی سب سے بڑی دوربین ہوگی خوش قسمتی سے یہ دوربین بن چکی ہے لیکن ابھی اس حد تک مکمل نہیں ہوئی کہ اس سے کام لیا جا سکے، یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس دوربین میں خالی آنکھ سے دس لاکھ گنا زیادہ روشنی داخل ہوگی، اس کی مدد سے ہم زیادہ فاصلے کے کثیر التعداد فلکی نظاموں کو دیکھ سکیں گے مگر پھر بھی ہمارا علم کائنات یقیناً نامکمل رہے گا، جوں جوں ہمارا سائنس اور فلکیات کا علم ترقی کرتا جائے گا، جس کی ہمیں ہر طرح سے توقع ہے یقیناً ہماری معلومات ایک طرف چھوٹے سے چھوٹے اور دوسری طرف بڑے سے بڑے عالموں کے متعلق وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے گی مگر باوجود اس قدر ترقی کے ہمارا علم بہرحال نامکمل ہی رہے گا ہم کائنات کی وسعت کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ پائیں گے اور فضائے بسیط کی حقیقی گہرائی کے متعلق جو تصورات اور نظریات بھی قائم کریں گے ان کی حیثیت خیال آرائی سے زیادہ نہ ہوگی۔

عالم ماورائے عالم انسانی تخیل کی رسائی حد نظر سے کہیں آگے ہے، وہ بے تکلف یہ تصور کر سکتا ہے کہ ممکن ہے یہ کروڑوں کہکشانی نظام خود ایک مافوق کہکشانی نظام کے اجزاء ہوں جس کا عمل ہمارے کہکشانی نظام سے ملتا جلتا ہو تخیل اور اونچے اڑ کر ایک فوق الفوق کہکشانی نظام فرض کر سکتا ہے جو کروڑوں مافوق کہکشانی نظاموں پر مشتمل ہو تخیل جہاں تک چاہے بڑھتا چلا جائے لیکن مشاہدہ کائنات کی اس عظیم الشان وسعت کی پیمائش سے قاصر ہے، اور قاصر رہے گا جو آئن اشٹائن کا سا بے باک تخیل رکھتا ہو، وہی یہ کر سکتا ہے، کہ فضائے بسیط کو محدود اور دائرۂ ادراک کے اندر سمجھ لے اور اس کے نصف قطر کا تخمینہ بھی لگائے۔ ایڈنگٹن نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ معلوم کیا ہے کہ پوری کائنات کے برقیوں کی کل تعداد ۷۹، ۱۰ × ۹۳۲۱ ہے، خوشی کی بات ہے کہ حال میں آئن اشٹائن نے مجبور ہو کر محدود فضا کے فرضیے کو ترک کر دیا ہے انسان کی یہ کوشش کہ وہ کائنات کے عرض و طول کی پیمائش کرے، انتہائی گستاخی ہے اسے یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ وہ اس وسیع قلمرو کی وسعت اور گہرائی کی پیمائش سے قاصر ہے۔

زبردست معمہ اگر ہم کائنات کی ساخت کے متعلق حکماء کے خیالات کی نشوونما کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح یکے بعد دیگرے متعدد نظریے قائم اور ترک کئے گئے۔

سورج اور چاند کا طلوع و غروب، ثوابت اور سیارے ابتدائی زمانہ کے ہیئت دانوں کے لئے ایک زبردست

صدتے؛ بابل کے ہیئت دانوں نے یہ دریافت کیا تھا کہ سال میں ۳۶۰ دن ہوتے ہیں وہ اس کو بارہ قمری مہینوں میں تقسیم کرتے اور پھر وقتاً فوقتاً ان میں لوند کے مہینوں کا اضافہ کر کے اس کو شمسی سال میں تحویل کر لیا کرتے تھے۔ آسمان کو انھوں نے بارہ حصوں یا بروج میں تقسیم کیا تھا، ہر ایک برج کے لئے ایک نشان مقرر تھا جو کسی خیالی دیوتا یا جانور کو ظاہر کرتا تھا۔ بروج کی مقررہ علامتوں کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ اجرام فلکی کے ساتھ مل کر یہ انسانی اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس اوہام پرستی سے علم نجوم نے جنم لیا، جو کہ اب تک پوری طرح مٹنے نہیں پایا ہے۔ وہ زمین کو چپٹا تصور کر کے اور کائنات کو ایک بند گنبد سے تشبیہ دیتے اور سطح زمین کو اس کا فرش سمجھتے تھے۔ دریائے فرات کے منبع کو مرکز زمین قرار دے کر انھوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ زمین کے چاروں طرف پانی اور اس سے آگے سر بفلک پہاڑ ہیں جن پر گنبد افلاک قائم ہے۔ ان کا یہ تصور فطری تھا، اس لئے کہ ان کی اپنی سلطنت پہاڑوں اور سمندر سے گھری ہوئی تھی وہ اس تصور کی حقیقت پر کامل یقین رکھتے تھے۔

مصریوں کا تصور کائنات بھی اہل بابل کے تصور کے مشابہ تھا، ان کا خیال تھا کہ زمین ایک مستطیل صندوق ہے جس کا طول شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے اور پیندا مجوف شکل کا ہے، جس کے مرکز میں مصر کا ملک واقع ہے، ان کا یہ تصور دریائے نیل کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی آبادی سے مطابقت رکھتا تھا۔ آسمان کو ایک محراب نما چھت سمجھتے تھے، جسے چاروں کناروں پر پہاڑوں کی چار چوٹیاں بطور ستونوں کے اٹھائے ہوئے ہیں، اور ستاروں کو ایک قسم کے چراغ جو رسیوں کی مدد سے لٹک رہے ہیں۔ اس صندوق کے ارد گرد ایک بہتا ہوا دریا تصور کرتے تھے، جس میں ایک آتشیں قرص لئے ہوئے ایک کشتی تیرتی پھرتی ہے، یہ ان کا سورج تھا، دریائے نیل اس فلکی ندی کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی، اہل مصر کو کائنات کے اس تخیل کی حقیقت میں ذرہ بھر بھی شبہ نہ تھا۔

اگرچہ قدیم اہل ہند نے علم ہیئت کے متعلق بہت سی قابل قدر معلومات فراہم کر لی تھیں لیکن ان کا عقیدہ تھا کہ زمین ایک مسطح گول قرص ہے جس کو ایک گائے اپنے سینگ پر اٹھائے ہوئے ہے، اور جب کبھی گائے زمین کو ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر منتقل کرتی ہے تو اس کے سر کی جنبش سے زلزلہ آتا ہے، یہ عقیدہ اب بھی اس ملک کے بعض دماغوں میں جاگزیں ہے۔

متضاد نظریات | اہل یونان کو اس سلسلہ میں اولیت کا شرف حاصل ہے کہ انھوں نے ہیئت کو علمی بنیادوں پر قائم کیا۔ حکیم طالیس (جو اصل میں فنیقی تھا) کا شمار یونان کے حکماء ہفت گانہ میں ہوتا ہے، اس کا زمانہ چھ سو سال قبل مسیح تھا، یہ پہلا شخص ہے جس نے آسمان کا خاکہ کھینچ کر روشن ستاروں کے مقابلہ میں سورج اور چاند کے محل وقوع کو ظاہر کیا۔ اس طرح وہ اجرام فلکی کی حرکات کا زیچ

صحت کے ساتھ پتہ لگانے میں کامیاب ہوا' چھٹی صدی قبل مسیح میں حکیم فیثاغورث سب سے پہلا شخص تھا' جو اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ دور سے آنے والے جہازوں کے مستول سب سے پہلے دکھائی دیتے ہیں' اس نتیجہ پر پہنچا کہ زمین کی شکل کرہ نما ہے' اسی نے اس مسئلہ کو بھی پیش کیا' کہ آفتاب نظام فلکی کا مرکز ہے' فیثاغورث کو نظریۂ مرکزیت شمس... helio-centric کا بانی سمجھنا چاہیئے' تقریباً ۲۵۰ قبل مسیح میں ہیراقلیطس نے فیثاغورث کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے یہ بتایا کہ زمین فضا کے وسط میں اپنے محور پر گردش کرتی ہے اور جب کہ سورج اور بڑے سیارے زمین کے گرد حرکت کرتے ہیں' زہرہ اور عطارد سورج کے اردگرد گھومتے ہیں' مرکزیت ارض کا یہ نظریہ قریب تین سو سال تک مسلمہ رہا' ۳۱۰ تا ۲۳۰ قبل مسیح میں ارسطارکوس نے جو عہد قدیم کا کوپرنیکس کہلاتا ہے' چاند گرہن کی مدد سے تخمینہ لگا کر سورج اور زمین کے قطر کی باہمی نسبت معلوم کر کے ثابت کیا کہ سورج زمین سے بہت بڑا ہے' اس کا تخمینہ تو غلط تھا' مگر اس کا طریق عمل معقول تھا' اسی نے یہ فرضیہ بھی پیش کیا کہ زمین کی دو گردشیں ہیں یعنی یہ کہ اپنے محور پر گھومنے کے علاوہ سورج کے مرکز کے گرد ایک دائرہ نما سیر پر بھی گردش کرتی ہے اور چونکہ بعض ثوابت باوجود اس گردش کے آسمان میں اپنی جگہ پر قائم دکھائی دیتے ہیں وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ ثوابت بے انتہا فاصلے پر ہوں گے' اس کا یہ تصور تھا کہ پورا نظام شمسی اس بے پایاں فضا میں محض ایک نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے' ان ستاروں کے فاصلے کو زمین کے سیر سے وہی نسبت ہے جو کسی کرہ کے نصف قطر کو اپنے مرکز سے ہوتی ہے'

لیکن مرکزیت ارض کا نظریہ کہ زمین گردش کا مرکز ہے' بہرحال رائج ہو گیا' اور ہپرکوس (۱۳۰ قبل مسیح) نے سورج چاند اور اجرام فلکی کی ظاہری حرکت کی توجیہ اس مفروضے کی بنیاد پر کی کہ یہ سب کے سب ایسے شفاف کروں میں گھومتے ہیں جو زمین کے ساتھ ہم مرکز ہوں'

<u>بطلیموسی چکر</u> | دوسری صدی عیسوی (۱۰۰ تا ۱۷۰ء) میں مصر میں مشہور ریاضی دان بطلیموس کا ظہور ہوا' چونکہ اجرام فلکی یکساں طور پر گردش نہیں کرتے تھے' اس لیے بطلیموسی نظام کو ان کی دائمی حرکت کی تشریح کے لیے متعدد افلاک اور ان کے ساتھ بڑے اور چھوٹے چکروں کا ایک پیچیدہ سلسلہ فرض کرنا پڑا' بطلیموس نے کہا کہ زمین کائنات کے وسط میں اپنی جگہ پر قائم ہے اور افلاک اس کے گرد ۲۴ گھنٹے میں ایک بار گھومتے ہیں' اس کے یہ معنی ہوئے کہ کل افلاک سورج' چاند' اجرام فلکی اور ان متعلقوں سمیت جو ان میں جڑے ہوئے ہیں' زمین کے اردگرد ۲۴ گھنٹے میں ایک بار گھوم جاتے ہیں' آسمان کے متعلق یہ خیال تھا

کہ وہ ٹھوس اور گنبد نما شکل کا ہے اور اپنے زبردست محور پر گھومتا ہے اور ستارے اس کی سطح میں جڑے ہوئے ہیں، اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمام آسمان بلوری کروں سے معمور ہے اور یہ بلوری کرے اجرامِ فلکی کو اپنے چھوٹے اور بڑے چکروں میں گھماتے ہیں اور اس کے دلائل حسب ذیل تھے:۔

۱۔ جب کوئی شخص ایک جگہ کھڑا ہو کر اچھلتا ہے تو اس کے پاؤں کے نیچے کی زمین آگے نہیں نکل جاتی اور اگر زمین متحرک ہوتی تو اچھالے ہوئے اجسام پیچھے رہ جاتے اور جس نقطہ سے انہیں اچھالا گیا ہے اس کے مغرب کی جانب گرتے، اس لئے کہ اسی اثنا میں ان کے نیچے کی زمین آگے بڑھ چکی ہوتی۔

۲۔ بادل ہمارے سر پر مشرق سے مغرب کو حرکت نہیں کرتے اور اگر زمین گھوم رہی ہوتی تو ان کا طریق عمل ضرور ایسا ہوتا اس لئے کہ وہ زمین کے ساتھ بندھے ہوئے نہیں،

۳۔ خلا مستقر پر ان چیزوں میں جو زمین میں پیوست نہیں ہیں، شدید حرکت پیدا ہو جاتی وہ اڑ کر بکھر جاتیں اور زمین پاش پاش ہو جاتی، ظاہر ہے کہ اگر کوئی قوتِ کشش موجود نہ ہوتی تو ان کی حالت ان سنگ ریزوں کی مانند ہوتی جو کسی متحرک پہیے پر رکھ دیئے گئے ہوں۔

۴۔ جوں جوں زمین اپنے میسر پر حرکت کرتے ہوئے فضا میں طویل فاصلے طے کرتی، تو ستارے آپس میں جگہ بدلتے ہوئے دکھائی دیتے،

ہیپرکوس اور بطلیموس کا پیش کردہ نظام گو تفصیلات میں الجھا ہوا تھا، تاہم وہ سورج چاند اور اجرامِ فلکی کی ظاہری حرکت کی توجیہ اس مفروضے کی بنا پر کر سکتے تھے، کہ ہر مادی جسم ایک میسر یا چھوٹے چکروں پر گھومتا ہے اور خود یہ میسر زمین کے گرد عظیم الشان مدور میسر پر گردش کرتا ہے بطلیموس ان چھوٹے بڑے چکروں کی حالت اور ان کی وسعت مشاہدہ کی مدد سے متعین کرنے میں کامیاب ہوا اور کچھ جدولیں بھی تیار کر لی تھیں جن کی مدد سے فلکی اجسام کی آئندہ جائے وقوع اور سورج اور چاند گرہن کے اوقات کے متعلق بھی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی، البتہ اس نے اس رفتار کا حساب نہیں لگایا جو کہ دور دراز ستاروں کو زمین کے اردگرد چوبیس گھنٹے میں ایک بار گھومنے کے لئے درکار ہے اگرچہ یہ نظام ہمیں آج کل مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، مگر دنیا کے علمائے ریاضی سائنس اور فلسفہ تقریباً ۱۴۰۰ سال تک اس کو سب سے زیادہ مکمل اور حقیقت کے مطابق مانتے رہے۔ خوب ہیئت دان قصدیوں تک اس پر جمے رہے اور قرونِ وسطیٰ میں ان کی بدولت یہ نظام تمام یورپ میں رائج ہو گیا بطلیموس کے نتائج بالکل

ناگزیر سمجھے جاتے تھے۔

الفرغانی نے نہ صرف بطلیموسی نظام اور اس کے استقبال اعتدال کی قیمت کو تسلیم کیا بلکہ یہ خیال قائم کیا کہ یہ نظام ستاروں کے علاوہ اجرام فلکی پر بھی حاوی ہے۔ نویں صدی عیسوی میں ثابت بن قرہ نے حرکات اجرام فلکی کے بطلیموسی نظریہ کو ایک نویں کرہ کا اضافہ کر کے بہتر بنانے کی کوشش کی، تاکہ اعتدالین کی فرضی غیر استقلالی کیفیت کی توجیہ ہو سکے۔ آگے چل کر البطانی نے اس نظریہ کی مناسب طور پر تردید کی۔

نظریہ کوپرنیکس | نکولس کوپرنیکس (۱۴۷۳-۱۵۴۳ء) جو پروشیائی پولینڈ میں پیدا ہوا، پہلا شخص تھا جس نے یہ معلوم کیا کہ بطلیموس کے نتائج میں کوئی بنیادی غلطی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ ارشارکوس کے اس خیال کو تسلیم کرنے میں زیادہ سہولت ہے کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا بلکہ زمین اور دوسرے اجرام فلکی سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو قدما کا خوشہ چین سمجھتا تھا۔ اس نے بطلیموس کی دلیلوں کا یہ الزامی جواب دیا کہ اگر آسمان متحرک ہوتا تو چونکہ اس کا محیط بہت بڑا ہے، وہ زیادہ تیزی سے گردش کرتا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا۔ اگر زمین قائم ہوتی اور آسمان گردش کر رہا ہوتا، تو سطح آسمان منتشر ہو جاتی اور تمام ستارے ادھر ادھر بکھر جاتے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ آگے چل کر اس نے اجرام فلکی کی رجعت قہقری کی توجیہ کی، جو کہ اس سے پہلے ایک چیستان سمجھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے زمانہ...... اعتدالین کی صحت کے اس نظریہ کی بھی توجیہ پیش کی، جس کو اس سے پہلے ہپرکوس ۱۵۰ قبل مسیح میں دریافت کر چکا تھا۔ مگر کوپرنیکس کا یہ خیال تھا کہ تمام ستارے اپنی جگہ پر قائم ہیں اور ان کا فاصلہ سورج سے ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔

اس زمانہ میں یہ ایک ایسا انقلاب انگیز خیال تھا کہ اس پر عیسوی کلیسا کا قہر و غضب نازل ہونا لازمی تھا۔ کلیسا زمین کو جو انسان کا مسکن اور حضرت عیسیٰ کا مہبط ہے، کائنات میں سب سے اہم چیز سمجھتا تھا۔ اور اس کی غیر معمولی اہمیت کو قائم رکھنے کے لئے یہ تصور ضروری تھا کہ وہ ایک مرکز ہے جس کے گرد آسمان گھومتے ہیں۔ کوپرنیکس نے اپنے نظریے کی تائید میں کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، ایک کتاب لکھی لیکن کلیسا کے تشدد کے خوف سے اس کی اشاعت کو روکے رکھا، یہاں تک کہ اس کی موت قریب آ پہنچی۔ اب اس نے یہ کتاب چھپوائی، لیکن اسے اپنی تصنیف کا پہلا مطبوعہ نسخہ ٹھیک اس دن ملا جس دن اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ پہلے پہل تو اس کی کتاب کو نظر انداز کیا گیا لیکن بعد میں کلیسا نے اس کا پڑھنا قطعاً ناجائز قرار دے دیا۔ یہ مسئلہ جسے کوپرنیکس نے دوبارہ دریافت کیا تھا علم ہیئت کی تاریخ کا ایک عہد آفرین واقعہ تھا، مگر اس کا

اعتراف کرنا تو درکنار کلیسا نے اس کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دیدی' آخر کار ۱۸۲۲ء میں جب کہ کوپرنیکس کی وفات کو ایک مدت گذر چکی تھی' پاپائے اعظم نے مرکزیت شمس کے نظام کو باضابطہ طور پر تسلیم کیا'

سولہویں صدی کے نصف آخر میں (۱۶۰۱-۱۵۴۶ء) ٹائیکو براہی نے کوپرنیکس کی تصنیف کا مطالعہ کیا' لیکن زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا وہ قائل نہیں ہوا' اس نے اس بات کو تو تسلیم کیا کہ زمین کے علاوہ باقی تمام سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں' لیکن اس بات میں وہ بطلیموس کا ہم خیال تھا کہ سورج مع تمام سیاروں کے زمین کے گرد گردش کرتا ہے' جو ساکن اور اپنی جگہ پر قائم ہے' بہرحال' ٹائیکو براہی نے اپنی تحقیقات سے علم ہیئت میں قابل قدر اضافے کئے' اور چاند کی حرکت کے کچھ نئے قانون بھی دریافت کئے۔

کیپلر کے قوانین اجرام فلکی | پروشیا کا جون کیپلر (۱۶۳۰-۱۵۷۱ء) جو ٹائیکو براہی کا چیلا تھا' اپنے استاد سے بھی بڑا ہیئت داں ثابت ہوا' اس نے کوپرنیکس کے نظریہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے معلوم کیا کہ تمام اجرام فلکی سورج کے گرد بیضوی مسیروں پر چکر کاٹتے ہیں' اس کے علاوہ اس نے حرکت اجرام کے تین قانون دریافت کئے' جو اسی کے نام سے موسوم ہیں' ان قوانین کی مدد سے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ کس سیارے کی جگہ اپنے مسیر میں اس وقت کہاں ہے یا فلاں وقت کہاں تھی' کیپلر کے قوانین جدید علم ہیئت کی اساس ہیں جو بالکل علمی اصولوں پر مبنی ہے'

ارسطو کا تصور | متقدمین کے لئے اجسام فلکی کی مسلسل حرکت ایک معمہ بنی رہی۔ ارسطو کا تصور افلاطون کے برعکس یہ تھا کہ مسلسل حرکت کے لئے ایک مسلسل قوت محرکہ کی ضرورت ہے' اس بنا پر اس نے ایک قائم محرک (Unmoved Mover) فرض کرلیا' ارسطو کے نظریہ کے مطابق تمام اجسام یا جسم بھاری یا ہلکے ہوتے ہیں اور ان کے گرنے یا چلنے کی رفتار........

........ان کے بھاری پن یا ہلکے پن کے متناسب ہوتی ہے' اس لئے کہ وہ ہمیشہ اپنی حقیقی جگہ کے متلاشی رہتے ہیں ارسطو کا خیال تھا کہ ایک ہی مادہ کے بنے ہوئے دو اجسام کو یکساں بلندی سے ایک ساتھ گرایا جائے تو زیادہ بھاری جسم' بمقابلہ ہلکے جسم کے زمین پر پہلے گرے گا اور گرنے کے وقت اور اس کے وزن میں نسبت معکوس ہوگی' ۱۹۰۰ سال تک نہ تو کسی نے اس پر کوئی اعتراض کیا' اور نہ اس کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت گوارا کی'

گیلی لیو کا قانون حرکت | ۱۵۹۱ء میں اٹلی کے ایک عالم گیلی لیو (۱۶۴۲-۱۵۶۴) نے ایک دس پونڈ وزنی اور دوسرا ایک پونڈ وزنی گولا لے کر دونوں کو بیک وقت پیسا کے مائل مینار کی چوٹی سے گرایا' اس نے معلوم کیا کہ یہ دونوں گولے ایک ساتھ زمین پر پہنچتے ہیں' اس کے بعد اس نے یہ دریافت کیا کہ زمین کی طرف گرتے ہوئے اجسام کی رفتار میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے' اس نے ارسطو کے اس خیال کی تردید کی کہ طے شدہ فاصلہ وقت کے متناسب ہوتا ہے اور اس کی بجائے یہ دریافت کیا کہ طے شدہ فاصلہ وقت

کے مربع کے متناسب ہوتا ہے۔ گیلی لیو نے یہ بھی دریافت کیا، ایک جسم ڈھلوان سطح پر لڑھکنے کے بعد اپنے اندر معیارِ حرکت رکھتا ہے اور کسی دوسری ڈھلوان سطح پر اسی بلندی تک اوپر کو چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ البشرطیکہ اس کے راستے میں مزاحمت اتنی خفیف ہو کہ ناقابلِ شمار ہو، پس گیلی لیو کی تحقیقات سے یہ بات حتمی طور پر مان لی گئی کہ ارسطو کے خیال کے برعکس حرکت کے بجائے ابطار یعنی حرکت کے سست پڑ جانے کو خارجی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ گیلی لیو نے علم ریاضی کی نئی شاخ ارضی حرکیات کی بنا ڈالی اور فاصلے اور وقت کے قدیم تصورات کو ریاضیاتی شکل میں مرتب کیا، پیسا کے بڑے گرجا گھر میں اس نے ایک معلق قندیل دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا، کہ خواہ اس کے جھولنے کا فاصلہ بڑا ہو یا چھوٹا اس کی ضربیں بالکل باقاعدہ ہوتی ہیں، اس مشاہدہ کی بنا پر اس نے رقاص ایجاد کیا ۱۶۰۹ء میں گیلی لیو کو معلوم ہوا کہ ہالینڈ کے کسی شخص نے نئی قسم کا ایک شیشہ ایجاد کیا ہے، جس میں سے دور کی اشیا بڑی دکھائی دیتی ہیں، چنانچہ اس نے بہت جلد ایک دوربین تیار کر لی اور اس کی مدد سے اس نے چاند کی سطح کو دیکھا اور پھر کہکشاں کو دیکھ کر معلوم کیا کہ اس میں لاتعداد ستارے ہیں جو خالی آنکھ سے نہیں نظر آتے، اس نے یہ بھی معلوم کیا کہ مشتری کے چار توابع ہیں،

....

..........اور یہ سیارہ گویا ایک مختصر سا نظام شمسی ہے، اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ ان توابع کی گردش کے ماوزن کا تخمینہ لگایا، گیلی لیو نے یہ بھی دریافت کیا کہ سورج اپنے محور پر گھومتا ہے، اس نے بطلیموسی نظام کے مقابلہ میں کوپرنیکس کے نظریہ کی تبلیغ شروع کی، لیکن باوجود ان کارہائے نمایاں کے محکمہ احتساب نے اسے بلا کر یہ حکم دیا کہ وہ اس نظریہ کے باطل ہونے کا اقرار کرے، اس عقوبت کے خوف سے جس کی کہ اس کو دھمکی دی گئی تھی اس نے اپنے خیالات کی تبلیغ بند کر دی، اس کے کچھ عرصہ بعد جب گیلی لیو نے ایک کتاب شائع کی جس میں زمین کا سورج کے گرد گھومنا ثابت کیا گیا تھا، تو کلیسا نے اس کو انجیل مقدس کی تعلیمات کے صریحاً خلاف سمجھتے ہوئے اسے الحاد کے الزام میں نظر بند کر دیا،

نیوٹن کا قانون کشش ثقل | اسحاق نیوٹن (۱۶۴۲-۱۷۲۷ء) ۱۶۶۵-۶۶ء کے دوران میں سیاروں کے مسائل کی تحقیقات میں منہمک تھا، لیکن اس نے اپنے نتائج کی اشاعت کو ۱۶۸۵ء تک ملتوی رکھا جبکہ اس نے اپنے قانون معکوس مربع کے ثبوت میں یہ بات دریافت کر لی کہ کشش ثقل کی وجہ سے کھینچنے والے مادہ کا ایک گولا اپنے اردگرد کے اجسام کو اس طرح کھینچتا ہے، گویا اس کی ساری کی ساری کمیت اس کے مرکز پر سمٹ آئی ہے، اب تک وہ اس سے ڈرتا تھا کہ جو اجسام فاصلے پر واقع ہیں، ان کے عمل کشش کی توجیہ کس طرح کرے گا اس اثنا میں

کرسچین ہیوگنز نے ایک دائرہ کے گرد گھومنے والے جسم کی اسراع کو ثابت کیا، یہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلا آپ ہی آپ چلنے والا گھنٹہ بنایا جو فلکیات کے کاموں کے علاوہ طول البلد کا تعین کرنے میں خاص طور پر مفید ہے، ہک اور ہیوگنز دونوں نے یہ ثابت کیا کہ اگر سیاروں کے سیروں کو دائرہ نما مان لیا جائے، تو لازمی طور پر معکوس مربع کا قانون قوت کارفرما ہوگا، یہ حقیقت ہیوگنز کے قیمت اسراع کے ثبوت اور کیپلر کے دوری اوقات کے مکعبوں کے تیسرے قانون سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے، سر اسحاق نیوٹن نے درخت سے گرتے ہوئے سیب پر غور کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا، کہ یہ واقعہ قانون کشش ثقل ہی کا نتیجہ ہے، اور یہی قانون پہاڑ پر چڑھنے والے شخص پر بھی عاید ہوتا ہے، خواہ وہ کتنی بلندی پر پہنچ جائے۔ عمل استقرار کی مدد سے اسے یہ عجیب و غریب نکتہ سوجھا، کہ شاید چاند کی حرکت بھی اسی قانون کی تابع ہو اور سورج کے گرد گھومنے والے تمام سیاروں کی حرکت بھی۔

نیوٹن یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ معکوس مربع کا قانون چاند کی حرکت پر صادق آتا ہے، اس نے اپنی کتاب Principia جو علم سائنس کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، ۱۶۸۷ء میں شائع کی، نیوٹن نے گیلی لیو کے قوانین حرکت کو از سر نو زیادہ صحیح الفاظ میں منضبط کیا، یہ قوانین پورے برِاعظم یورپ میں تو نہیں لیکن جزائر برطانیہ میں نیوٹن کے قوانین حرکت کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گیلی لیو، ہیوگنز، اور نیوٹن جدید مکانک کے بانی ہیں،

کشش ثقل کی رفتار | نیوٹن نے کشش ثقل کا کوئی ثبوت دینے کی کوشش نہیں کی جس کا قانون اس نے مرتب کیا تھا، ہیوگنز کا اعتراض اس قانون پر یہ تھا کہ فاصلے پر کشش کا اثر ممکن ہی نہیں، اس اعتراض کو رفع کرنا نیوٹن کے لیے مشکل ہوگیا، نیوٹن کا بنیادی مفروضہ یہ تھا، کہ کشش ثقل کا عمل فوری ہوتا ہے، اس لئے اس کا اثر ہر فاصلے پر فوراً ظاہر ہوتا ہے خواہ وہ کتنا ہی دور دراز کیوں نہ ہو، بلا لحاظ اس کے کہ جسم معمول ساکن ہے یا متحرک اور اگر متحرک ہے تو رفتار حرکت کیا ہے، فوری اثر کا ریاضی کی زبان میں یہ مفہوم ہے کہ کشش ثقل کی رفتار لامحدود ہے اور ہر متحرک جسم کی نسبت سے ہمیشہ یکساں رہتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی تیز رفتاری سے گھوم رہا ہو،

لاپلاس نے محدود رفتار کے مفروضیہ کی تحقیقات شروع کی، لیکن سوئے اتفاق سے اس نے ابتدا ہی سے یہ خیال قائم کر لیا، کہ تمام کائنات ایک قسم کے سیال واسطے سے معمور ہے جو اپنے دباؤ سے اپنے اندر ڈوبے ہوئے اجسام پر کشش ثقل کا اثر پیدا کرتا ہے، اس فرضیے سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ کشش ثقل کھینچنے والے جسم کو کھینچے والے جسم کی طرف ہوتی ہے، تب لاپلاس نے یہ دریافت کیا کہ اگر کشش ثقل کی رفتار محدود ہوتی، تو ایک سیارے کے سیر میں بہت

بڑا خلل پڑ جاتا۔ البتہ اگر کشش ثقل کی رفتار روشنی کی رفتار سے کئی کروڑ گنا زیادہ ہو، تو دوسری بات ہے۔ اب اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ کام چلانے کے لئے کشش ثقل کی رفتار کو لامحدود مانتے۔ اس کے خیال میں اس قسم کے خلل سے ستاروں کی حرکت میں رکاوٹ ہوتی اور لاپلاس اس خلل کو اس مفروضے کی بنا پر دور نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی مزاحمت کرنے والا واسطہ موجود ہے۔ لہذا کشش ثقل کی محدود رفتار کا تصور ترک کرنا پڑا۔ اگرچہ گزشتہ چند سال تک خود اضافیت میں بھی کشش ثقل کی محدود رفتار کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہ مفروضہ محض ایک مصنوعی چیز تھی، جس کا انحصار محدودوں کے مخصوص انتخاب پر تھا۔

سیر کی حرکت | نیچون اور پلوٹو دو نئے سیاروں کے انکشاف سے نیوٹن کے قانون کی حیرت انگیز طور پر تصدیق ہو گئی مگر یہ قانون ایک اہم امر میں بالکل ناکامیاب رہا۔ قرص آفتاب سے عطارد کا عبور ایک دلکش منظر فطرت ہے، قران کے موقع پر ایک سیاہ دھبے کی شکل میں اس سیارے کو گذرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ قرص آفتاب پر اس سیارے کا عبور کچھ وقفوں سے ہوتا ہے جن کی میعاد تین سے تیرہ سال تک ہے۔ اس عبور سے اس کی گردش کی مدت معلوم کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں تقریباً تین سو سال سے مشاہدات جمع کئے جا رہے ہیں۔ ان سے ایک غیر معمولی بات یہ معلوم ہوئی کہ عطارد کا سیر آہستہ آہستہ ۴۳ ثانیے فی صدی کے حساب سے اپنی جگہ سے ہٹ رہا ہے یعنی سیر کا سب سے قریبی نقطہ جو بعد اقرب کہلاتا ہے اس رفتار سے آگے بڑھتے ہوئے اس حد سے دور نکلا جاتا ہے، جہاں تک کہ اسے نیوٹن کے قانون کے مطابق بڑھنا چاہیئے۔ اس انحراف کو سب سے پہلے لیوریر نے ۱۸۵۹ء میں معلوم کیا، مگر اس نے اس واقعہ کی یہ توجیہ کی کہ سورج اور عطارد کے مابین کچھ چھوٹے سیارے ہیں جو اس رفتار کا سبب ہیں۔ لیکن گرہنوں کے موقع پر جو فوٹو کھینچے گئے ہیں ان سے ان سیاروں کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ سنہ ۱۹۰۱ء کے سورج گرہن کے موقع پر یہ بات قطعی طور پر تسلیم کر لی گئی تھی کہ سورج کے نزدیک دکھائی دینے والے تمام اجسام معلوم کئے جا چکے ہیں اور ۱۰۰۰۰۰ اشراق کی روشنی تک کسی سیارے کا وجود نہیں ہو سکتا، اور نہ چھوٹے سیاروں کے کسی جھنڈ کے موجود ہونے کا امکان ہے۔ اگر ایسا ہوتا، تو آسمان ضرور روشن ہو جاتا۔ لہذا نیوٹن کا قانون کشش ثقل سیر کے بعد اقرب کی سبقت کو ثابت کرنے میں ناکامیاب رہا۔

آئن اسٹائن کے اصول موضوعہ | آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت عام نے عطارد کے بعد اقرب کی سبقت کی توجیہ پیش کی۔ آئن اسٹائن نے اپنی مساوات کے حاصل کرنے میں نہایت جرأت اور دلیری سے کام لیا۔ اگر گستاخی نہ ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اس کی بنیاد صریحاً ناقابل قبول مفروضات پر رکھی ہے اور نہایت ہی دقیق،

اور پیچیدہ عمل ریاضی یعنی احصائے ٹینسر (Tensor Calculus) سے مدد لی ہے، اس فرضیے سے یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے، کہ روشنی کی رفتار محدود ہے اور ایک متحرک جسم کی نسبت سے خواہ وہ کتنی ہی تیزی سے حرکت کر رہا ہو اور خواہ روشنی سامنے سے اس کے قریب آرہی ہو یا عقب سے اس کا پیچھا کر رہی ہو، اس کی رفتار وہی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ رہے گی، ایک ذرہ ب جو ریڈیم سے نکلتا ہے، ایک لاکھ بیس ہزار میل فی سکنڈ کے حساب سے حرکت کر سکتا ہے، لیکن روشنی کی رفتار اس متحرک برقیہ کی نسبت سے بدستور ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہوگی، خواہ روشنی مخالف سمت سے اس کے قریب آرہی ہو یا اس کا تعاقب کر رہی ہو، مکان و زمان کی مطلقیت کے متعلق نیوٹن کا جو تصور ہے، اس کے مطابق یہ فرضیہ مضحک اور مہمل قرار پاتا ہے، مگر آئن اسٹائن نے جرأت اور دلیری سے کام لے کر اپنے مہتم بالشان نظریہ کی بنیاد اسی عجیب و غریب فرضیہ پر رکھی،

چار امتحان | آئن اسٹائن کا نظریہ چار ابعاد رکھنے والے مکان و زمان کے وجود مسلسل کے فرضی تصور پر مبنی ہے، اس کے سمجھانے میں بہت ہی دقیق اور پیچیدہ ریاضیاتی تحلیل سے کام لیا گیا ہے، جس کو سمجھنا بہت ہی کم لوگوں کو موقع مل سکتا ہے، اس نظریہ کی شہرت اس دعوی پر مبنی ہے، کہ اس کے نتائج کی تصدیق چار ورنہ کم سے کم تین فلکی مظاہر کے مشاہدے سے ہو چکی ہے، جو حسب ذیل ہیں:-

۱- عطارد کے مسیر کی گردش۔

۲- سورج کے طیف میں طیفی خطوط کا ہٹنا،

۳- دور کے ستاروں سے آنے والی روشنی کا سورج کے پاس سے گذرتے وقت انصراف،

۴- کائنات کا انتشار پذیر ہونا۔

چوتھے مظہر فطرت یعنی انتشار پذیر کائنات کا جہاں تک تعلق ہے آئن اسٹائن نے نہ صرف یہ فرض کر لیا ہے کہ روشنی کی رفتار کسی متحرک جسم کی نسبت سے خواہ وہ کتنی ہی تیزی سے کسی سمت میں بھی حرکت کر رہا ہو، ہمیشہ یکساں رہتی ہے، بلکہ کشش ثقل کے علاوہ نظریہ اضافیت کے مطابق کائناتی قوت دفع (Cosmic Force) کو بھی لازمی طور پر تسلیم کرنا پڑتا ہے، اور عجیب و غریب بات یہ بھی ہے کہ اس کائناتی قوت دفع کی شدت دو اجسام کے درمیانی فاصلہ کی نسبت سے بڑھتی بھی جاتی ہے،

اس نظریہ کا رد | آئن اسٹائن کے انتشار پذیر کائنات کے نظریہ کی تائید امریکہ کے ایک عالم ڈاکٹر ہبل نے کی، مگر بعد میں

ڈاکٹر موصوف نے خطباتِ روڈس میں جو اس نے آکسفورڈ میں دیے تھے، اس بات کا اعلان کیا کہ بعد کے مشاہدات سے انتشار پذیر کائنات کے نظریہ کی قطعی تردید ہو گئی،

عطارد کے سیر کی گردش کا جہاں تک تعلق ہے، میں نے کئی سال سے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ زمان و مکان اور حرکت کے متعلق نیوٹن کے تصورات بالکل صحیح ہیں، اور اس کی مکانک میں صرف اتنی اصلاح کی گنجائش ہے کہ کشش ثقل کی رفتار کو بجائے لامحدود کے محدود مان لیا جائے، جب اتنی سی اصلاح کر لی گئی، تو سیرِ عطارد کی گردش کی رفتار بالکل اتنی ہی نکلی جتنی آئن اسٹائن کے نظریہ کے مطابق حاصل ہوتی ہے، اب رہا سورج کے طیف میں طیفی خطوط کا انحراف تو جہاں تک قرصِ شمسی سے آنے والی روشنی کا تعلق ہے، میری معلوم کی ہوئی قیمت آئن اسٹائن کی قیمت سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے اور اس کی تصدیق بھی ہو چکی ہے، روشنی کے طیفی انحراف سے متعلق آئن اسٹائن کی قیمت ہر حالت میں یکساں رہتی ہے، خواہ روشنی قرصِ آفتاب کے مرکز یا کنارے یا کسی دوسرے حصے سے آ رہی ہو، مگر میرے نظریہ کے مطابق اگر ہم مرکز سے کنارے کی طرف چلیں تو اس میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ کنارے پر پہنچ کر وہ آئن اسٹائن کے اعداد سے دگنا یعنی سو فی صدی زیادہ ثابت ہوگا،

ڈاکٹر راڈس نے ٹین کو حکومتِ ہند نے ۱۹ جون ۱۹۳۶ء کے سورج گرہن کے موقع پر جاپان کے شہر ہوکیدو روانہ کیا تھا، ٹھیک گرہن کے موقع پر سورج کی روشنی کے فوٹو کھینچے، انھوں نے جولائی ۱۹۳۷ء میں اپنے نتائج کا اعلان کیا، جن سے یہ پتہ چلا کہ طیفی انحراف کے اعداد جو قرصِ آفتاب کے کنارے کی روشنی میں واقع ہوتا ہے، آئن اسٹائن کے اعداد سے ٹھیک دوچند ہیں اس موقع پر میں یہ بھی بتا دوں کہ ڈاکٹر راڈس ہی وہ ہیئت دان ہے، جس نے کامل سورج گرہن کے موقع پر روشنی کے طیفی انحراف کا مشاہدہ کیا،

انصراف کا اختلاف | روشنی کا انصراف نیوٹن کی مکانک کے مطابق ۰۸ء ثانیہ آتا تھا، اور آئن اسٹائن کے نظریہ کی رو سے اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت ۷۵ء ۱ ثانیے نکلی، یہ نتیجہ تمام ستاروں پر حاوی سمجھا جاتا ہے، خواہ وہ سورج کے نزدیک ہوں یا دور، لیکن میرے نظریہ کے مطابق روشنی کا انصراف اس لحاظ سے کہ کسی ستارے کے مشاہدے کا خط سورج سے قریب ہے یا دور ۳۲ء ۲ اور ۶۱ء ۲ ثانیے کے درمیان ہونا چاہیئے۔

پروفیسر مکائیلوف نے ۱۹ جولائی ۱۹۳۶ء کے سورج گرہن کے موقع پر سائبیریا میں سورج کے پیچھے کے دو ستاروں کے فوٹو کھینچے (اس کے مقابلے میں جاپانی ہیئت داں نے صرف آٹھ کے فوٹو لیے)، اور ۱۹۳۷ء میں مزید مشاہدے ہوئے آخر کار ۱۹۳۹ء میں ان کی تحقیقات کا کام مکمل ہوا، انھوں نے از راہ عنایت اپنے نتائج

میرے پاس بھیجے ہیں جو کہ سائنس کے جرائد میں شائع کئے جا رہے ہیں ان مشاہدات کے چار اعداد ۴ء۴۰، ۲ء۲، ۲ء۲۲، ۲ء۵۸۸۳ اور ۲ء۹۳ ثانیہ ہیں جن کا اوسط انحراف ۲ء۰۳ ثانیے نکلتا ہے۔ پروفیسر کیمبل نے غلطی کے احتمال کے لئے ۲ء۱۰ ثانیہ کی گنجائش رکھی ہے۔ اگر ۲ء۱۰ ثانیے کے احتمالی فرق کو ان کی اوسط قیمت سے منہا کر دیا جائے تو ۲ء۱۵ ثانیے کا نتیجہ میرے معلوم کردہ اعداد کی حدود کے اندر اور آئن اسٹائن کی بڑی سے بڑی قیمت سے بھی ۵۰ فی صدی زائد ہوتا ہے۔

پس ڈاکٹر میلن، ڈاکٹر راسن اور پروفیسر کیمبل کے مشاہدات نے آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت عام کو مسترد کر دیا ہے۔ یہاں اور کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، صرف آئن اسٹائن کے ایک قول کا حوالہ دے دینا کافی ہے۔ اس نے کہا ہے:-

"جو نتائج اس (نظریہ اضافیت) سے اخذ کئے گئے ہیں ان میں سے اگر ایک بھی غلط ثابت ہو تو پورے نظریہ کو ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس میں ذرا سی ترمیم بھی نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اس کی پوری عمارت مسمار نہ کر دی جائے۔"

ایک ہم نشین سے خطاب

ہے ہجومِ کار دامن گیر جاں　　فرصتِ شعر و سخن مجھ کو کہاں
سر تہی سودائے عشقِ یار سے　　سینہ امینِ آرزو کے خار سے
نا امیدِ برگ و برِ نخلِ قلم　　مدعا نا آشنائے فکرِ رقم
پاسِ خاطر کا ترے لیکن خیال　　کر رہا ہے مائلِ ذوقِ مقال
اے کہ سینہ سے ترے وارائے دل　　سوزِ دل سے بے بہائے آب و گِل
پارۂ دل جب ترے سینہ میں ہے　　تیرا جوہر تیرے آئینے میں ہے
رکھ متاعِ دل سدا پیشِ نظر　　نسیہ نقدِ دو عالم سے گذر
چرخِ نیلی فام سے حیراں ہے کیوں　　گردشِ ایام سے نالاں ہے کیوں
راہِ دریا میں وجودِ کوہسار　　آبِ دریا کے لئے ہے رہوار
بے وجودِ کوہ دریا کا خرام　　ہو نہیں سکتا ذرا بھی تیز گام
تیرے حق میں راہ کی دشواریاں　　جس طرح شمشیر کو سنگِ فساں
ہو نہ جب تک راستہ صبر آزما　　کھل نہیں سکتا کبھی جوہر تیرا
دل پہ ہوتا ہے حوادث سے عیاں　　ممکناتِ زندگی کا اک جہاں
مشکلاتِ راہِ ہستی کا وجود　　تیری عظمت کو ہے تحریکِ نمود
تو جسے کہتا ہے گردابِ بلا　　ہے فقط تیری نگاہوں کی خطا
نزدِ عاقل حادثاتِ روزگار　　ہیں نشانِ رحمتِ پروردگار
تا کجا در بندِ غم باشی اسیر　　می ندانی گفتۂ مردِ خبیر
اے کہ منزل را نمی دانی ز راہ　　قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود　　ایں زمین و آسماں دیگر شود

الطاف حسین

سلیم کے نام ...... آٹھواں خط

تعزیت نامہ کا شکریہ۔ پچھلے دنوں اسلم مرحوم کی بیماری کی وجہ سے کچھ ایسا پریشان اور مصروف رہا کہ تمہارے کئی ایک خطوط جمع ہو گئے۔ اسلم کا حادثہ میرے لئے فی الواقعہ ایک نیا تجربہ تھا اور میں تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ اگر یہ تجربہ نہ ہوتا تو میرے دل کے کئی ایک گوشے بند کے بند رہ جاتے۔ اللہ نے اولاد تو نہ دی لیکن اولاد کے غم سے آشنا کرا دیا۔ اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ؎

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

اولاد سے محبت ایک فطری جذبہ ہے اس لئے اس کا کھو جانا فطرۃً موجب غم و الم۔ یہی وہ جذبہ تھا جو صاحبزادہ ابراہیمؓ کی وفات کے وقت شرف انسانیت کے پیکر تمثیلی۔ جناب سرورِ کائنات (علیہ التحیۃ والصلوٰۃ) کی آنکھوں میں موجِ غم بن کر امڈا اور ستارۂ صبحگاہی کی طرح سر مژگاں چمکا۔ ایک مرتبہ ایک بدو حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کسی تذکرہ کے ضمن میں اس نے بڑے فخر سے کہا کہ میں تو چھ بچوں کو اپنے ہاتھوں سپرد خاک کر چکا ہوں لیکن کیا مجال جو آنسوؤں کا ایک قطرہ میری آنکھوں کو نمناک کر سکا ہو! تو فطرت صحیحہ کے ان رموز شناس (صلعم) نے فرمایا کہ اگر تیرے سینہ میں دھڑکنے والے دل کی جگہ پتھر کا ٹکڑا رکھ دیا گیا ہو۔ تو اس کا کیا علاج! لیکن اس کے ساتھ ہی تصویر کا دوسرا رخ بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ جب حضورؐ کا گذر ایک قبرستان پر ہوا دیکھا کہ ایک عورت نے اپنے بچہ کی یاد میں اپنے حال کو تباہ کر رکھا ہے اور نالہ وگریہ اور شین وشیون سے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ فرمایا کہ دل کو سنبھالو۔ حوصلہ کرو۔ کیوں اس قدر بے حال ہوئی جاتی ہو؟ رونے والی نے بغیر آنکھ اٹھائے کہا کہ جانے والے اپنی راہ چلتے جاؤ تمہیں کیا معلوم کہ بچہ کا صدمہ کیسا ہوتا ہے۔ اسے کچھ وہی جان سکتا ہے جس پر خود گذری ہو۔ اس مقدس و تابناک چہرہ پر اشک آمیز تبسم کی قوس قزح کی سی لہر دوڑی اور گہری سانس بھر کر فرمایا کہ تجھے کیا معلوم کہ میں کتنے بچے اپنے ہاتھوں سے رخصت کر چکا ہوں لیکن ایمان اس خدا پر رکھتا ہوں جو کبھی مرنے والا نہیں۔

خوشا بخت ایسے وہ جن کے صدمات خدائے حی وقیوم پر ان کے ایمان کی پختگی کا باعث بنتے جائیں۔

لیکن سلیم! اس مسئلہ پر ذرا اور گہرائی میں اتر کر غور کرو۔ اولاد سے اتنا سا تعلق تو فطری ہے اور انسان اور حیوان میں

مشترک۔ حیوان ایک خاص مقام پر پہنچ کر (جہاں بچے کی پرورش کی ضرورت باقی نہیں رہتی) اس سے قطع علائق کر لیتے ہیں لیکن انسان اس کے ساتھ اپنی امیدوں کو اور بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ اور وہ بچہ اس کی آرزوؤں کا محور، تمناؤں کا مرکز اور مستقبل کا سہارا بنتا جاتا ہے۔ اور جب یہ سہارا ٹوٹ جاتا ہے تو اس کی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اسی کا نام غم و الم ہے۔ حالانکہ معاملہ کی صحیح نوعیت یوں ہے کہ مشیت ایزدی اپنی عظیم الشان اسکیم (امر) کے ماتحت ایک بچہ کی تخلیق کرتی ہے۔ اس تخلیق سے اس کے پیش نظر ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ اس بچہ کی پرورش و تربیت کی ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں (اور اسی غرض کے لئے محبت کا وہ فطرتی جذبہ عطا کیا جاتا ہے) اس کے بعد مشیت اپنی اسکیم کے ماتحت بچہ کو یہاں سے لیجاتی ہے کہ وہ کام اس سے پورا کیا گیا جس کے لئے یوں مضطرب و سوگوار ہوا جائے۔

مجھے فکر جہاں کیوں ہو! جہاں تیرا ہے یا میرا!

درحقیقت یہ تمام کرب و الم اور گریہ و بکا اس لئے ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے اس طبعی (حیوانی) زندگی سے بلند کوئی نصب العین نہیں۔ جس قوم کے سامنے بلند نصب العین ہو وہ اس کے حصول کی دُھن میں ایسی منہمک ہوتی ہے کہ اس کے افراد کو ان باتوں کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ غم و الم کا تعلق خیالات سے ہے اور جب انسان کے خیالات اور توجہات کسی خاص نقطہ پر مرکوز ہوں تو وہ اس قسم کی پریشانیوں کا شکار ہو ہی نہیں سکتا باقی رہا وہ مقصد (مشن) جسے ہم آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ تو اگر اس مقصد میں زندگی موجود ہے تو اسے آگے بڑھانے کے لئے ایک دنیا اولاد (بلکہ اولاد سے بڑھ کر) کام دیگی

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

(محمدؐ تم مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں۔ لیکن وہ تو اللہ کا رسول اور خاتم النبیین ہے) اسی حقیقت کبریٰ کی طرف دلالت کرتی ہے!

لیکن سلیم! تمہارے اس فقرہ پر مجھے افسوس بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی جو تم نے لکھا کہ آپ دہلی جیسے مقام پر جو طب کا مرکز ہے۔ کیا کوئی علاج ٹھکانے کا نہ ہو سکا؟ ارے بھائی۔ یہی تو وہ مقام ہے جہاں مشیت کے فیصلوں کے سامنے انسان کی بے بسی نکھر کر اوپر آجاتی ہے۔ تم مجھے کہتے ہو! اگلے دنوں ریڈیو پر ایک دلچسپ تمثیل نشر ہوئی۔ ہندوستان کا شاہنشاہ اعظم۔ شاہجہاں بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے اس کی تمام زندگی کی آرزوئیں۔ ملکہ ممتاز کے پیکر میں سمٹی ہوئیں۔ بستر مرگ پر پڑی ہیں۔ وہ شاہنشاہ جس کے پاس اس وقت کے انسانی ممکنات میں سے ہر شے موجود ہے۔ دنیا کے طب کے جالینوس اور بوعلی سینا۔ مریضہ کے دائیں بائیں سر بجریباں بیٹھے ہیں۔ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن ملکہ کی زندگی کا ستارہ

ڈوبتا چلا جا رہا ہے ہر نئی دوائی دیتے وقت شاہنشاہ کی آنکھوں میں امید کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی ناکامی پر وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہے اور غم والم میں ڈوبی ہوئی آواز سے کہہ اٹھتا ہے کہ

ہندوستان کا شاہنشاہ اور اس قدر بے بس!

سلیم! سوچو کہ شاہنشاہ شاہجہاں کے مقابلہ میں میری تدابیری وسعتوں کی بساط کیا؟ اور ایک شاہجہاں پر ہی کیا موقوف ہے۔ آج دنیا میں اس سے بھی بڑے بڑے "شاہجہاں" اسی طرح بے بس موت کا تماشا دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی امکان بھر علاج کیا۔ اور تم حیران ہو گے کہ کسی معالج کو یہ افسوس رہا کہ فلاں تدبیر آزما دیکھی اور نہ ہی مجھے حسرت کہ فلاں علاج نہ کر دیکھا۔ لیکن سلیم! بات یہی حق ہے کہ بیماری کا علاج ہو سکتا ہے۔ موت کا نہیں ہو سکتا۔ تدبیر اس لئے ضروری ہیں کہ کسی انسان کو یہ علم نہیں دیا گیا کہ فلاں مرض۔ مرض الموت ہے۔ مرض الموت میں تدابیر سے اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنی تسکین ضرور ہو جاتی ہے۔ تمہیں یاد ہوگا میں نے تمہیں ایک مرتبہ مائی بھولی کا واقعہ سنایا تھا۔ یہ جو گلی گلی کوچہ کوچہ پاگلوں کی طرح پھرتی ہے۔ ہوا یہی تھا کہ بیچاری کا جوان بیٹا، زندگی کا ایک ہی سہارا مریض نمونیہ کا اور گھر میں ایک پیسہ نہیں۔ حکیم نے نسخہ تو لکھ دیا لیکن دوا کہاں سے آئے۔ بیچاری بتا کی ماری ایک ایک کے دروازہ کھٹکھٹا آئی۔ کہیں سے آٹھ آنے کے پیسے نہ مل سکے۔ جاڑے کی راتیں۔ شدت کی سردی۔ رات بھر مریض "بغیر دوائی" کے پڑا رہا اور علی الصبح بیوہ ماں کی آغوش میں اس کی ساری دنیا لٹ گئی۔ بھولی کو یہی غم پاگل بنا گیا کہ اگر آٹھ آنے کے پیسے ہوتے تو شاید میرا بیٹا بچ جاتا۔ میں سلیم! اس وقت مشیت اور تدبیر کی پیچیدہ بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ اب تم معارف القرآن تمہارے پاس ہے اس میں اس بحث کو خود دیکھ لو۔ بات سمجھ میں آ جائے گی۔ اس وقت میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ سوچو کہ تمہارے ہاں کتنی مائیں ہیں جو بیچاری مائی بھولی کی طرح پاگل ہو جاتی ہیں اور کتنے باپ ہیں جن پر راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے جن کا بیٹا بیمار ہو۔ دوائی کے لئے پیسہ نہ ہو۔ اور وہ مر جائے۔ اف! سلیم!! تم اس قیامت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان مرنے والوں کو چھوڑ دو دیکھو بہت سے اس طرح پیچھے رہ جاتے ہیں جیسے بھری ہوئی کشتی بغیر ملاح کے بھنور میں پھنسی ہو۔ کیا تمہارے ہاں ان کی خبر گیری کے لئے بھی کوئی سامان موجود ہے؟ سلیم! اگر تمہیں کبھی اپنی تفریحات سے کچھ فرصت ملے تو جاؤ اور دیکھو کہ شہروں کی ان آبادیوں کے اندر جنہیں تمہاری تہذیب نے۔ زندگی۔ روشنی اور صفائی کی جنت قرار دے رکھا ہے وہاں کتنے گھرانے ایسے ہیں جن کا ایک ہی کمانے والا موت کے دھچکے سے اٹھ گیا اور اس کے بعد ان بیواؤں اور یتیموں کے لٹے ہوئے قافلہ کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ دیکھو اور سوچو کہ کیا ان کی کوئی ذمہ داری تمہارے اوپر عائد نہیں ہوتی؟ مطلب تمہاری ذات سے نہیں تمہارے اس نظام ملی سے ہے جس

ہیں ان مصائب کے حل کے لئے کوئی شعبہ ہی نہیں۔

سلیم: ایک تمہارا یہ نظامِ زندگی ہے اور ایک وہ نظام تھا کہ جب حضرت عمرؓ شام سے واپس آرہے تھے تو راستہ میں، آبادی سے دور صحرا کے ایک بوسیدہ خیمہ میں ایک ضعیف بدو عورت کو جاکر دیکھا، پوچھا کہ کیا حال ہے! اس نے کہا کہ کیا پوچھتے ہو! جب خلیفہ کو اس کی پرواہ نہ ہو کہ جو اس کی ذمہ داری میں دے گئے ہیں ان کی کیا حالت ہے تو کسی دوسرے کو ان کی حالت سے کیا غرض! (ضعیفہ کو کیا معلوم کہ وہ کس سے باتیں کر رہی ہے۔ اور معلوم بھی ہوتا تو وہ اسی طرح کہدیتی۔ وہاں شکایت کے گلے گھونٹے نہیں جاتے تھے) حضرت عمرؓ یہ سنکر ٹھٹکے۔ کہا کہ ضعیفہ! تم نے خلیفہ تک اپنی شکایت پہنچائی بھی تھی؟ اسے کیا خبر کہ تم پر کیا گذر رہی ہے؟ کچھ معلوم ہے جمیلہ! کہ اس نے کیا جواب دیا؟ سنو اور سننے کے بعد سوچو کہ اس نے کیا کہا۔ اس نے کہا کہ اگر خلیفہ اتنا انتظام نہیں کر سکتا کہ جو اس کی ذمہ داری میں دے گئے ہیں ان کے حالات سے باخبر رہے تو اسے خلافت کا کیا حق حاصل ہے۔ اسے چاہیئے کہ اپنے عجز کا اعتراف کرے اور زمامِ خلافت کسی اہل کے سپرد کر دے۔ دنیا میں خدا کی نیابت کا دعوےٰ ہے تو امکانی وسعتوں کے اندر خدا کی صفات کا عکس بھی اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا۔ خلیفہ اگر اپنی مملکت میں خبیر نہیں تو وہ خلافت کا اہل نہیں!

یہ تھے سلیم! ذمہ دار اور یہ تھی ان کی ذمہ داریوں کی تفسیر۔ قوم کی حالت ہمیشہ اوپر کے طبقہ سے وابستہ ہوتی ہے اور مصیبت یہی ہے کہ تمہارے ہاں اوپر کا طبقہ ایسا ہے کہ خاموشی بہتر۔ ورنہ نچلے طبقہ میں تو اب بھی بسا اوقات ایسی ایسی مثالیں سامنے آجاتی ہیں جن سے نگاہوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے۔ تم جب پچھلے سال یہاں آئے ہو تو تم نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے ملنے والوں میں سے ایک صاحب (ناز صاحب) ہمارے ساتھ قطب گئے تھے۔ یاد آگیا تمہیں؟ وہ سیدھے سادھے سے، نوجوان ایم۔ اے۔ ایم۔ اے (یعنی ڈبل ایم۔ اے) معقول مشاہرہ پر ملازم۔ اچھی حیثیت۔ عمدہ وجاہت۔ دو چار مہینے ادھر اپنے گاؤں گئے تو وہاں کسی غریب لڑکے نے کہا کہ بابو جی! اگر مجھے کہیں چپراسی کی جگہ مل جائے تو کنبہ پروری ہو جائے۔ یہاں آئے تو ایک دوست سے کہہ رکھا کہ کہیں چپراسی کی جگہ ہو تو مجھے اطلاع دینا۔ کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ ایک جگہ چپراسی کی اسامی نکلی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آدمی سوموار تک پہنچ جائے۔ انھوں نے اس لڑکے کو تار دیا۔ اس نے جواب لکھا کہ وہ آرہا ہے۔ ناز صاحب نے اتوار کو لڑکے کا انتظار کیا۔ وہ نہ پہنچا۔ سوموار کی صبح خود اسٹیشن پر گئے۔ لیکن وہ نہ آیا۔ اب یہ متردد تھے کہ بیچارے کا بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔ لیکن کیا کریں؟ تم ان کی جگہ ہوتے تو نہایت اطمینان سے کہہ دیتے کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب اگر وہ لڑکا نہیں آتا تو اس کی بلا سے۔ کیا میں چلا جاؤں؟ لیکن تمہیں پتہ ہے سلیم! ناز صاحب نے کیا کیا۔ مکان پر آئے۔ اپنے ہاں رخصت کی درخواست

بھجوادی۔ میلے کچیلے کپڑے پہن لیے۔ اور چپراسی کی جگہ جا بیٹھے۔ جھک کر آداب بجالائے۔ سارا دن چپراسی کا کام کیا اور کسی کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ چپراسی کے لباس میں کون ہے؟ شام کو وہ لڑکا بھی پہنچ گیا۔ دوسری صبح انھوں نے اس لڑکے کو کام پر بھیجا اور اپنے دوست نے ایک رقعہ لکھواکر ساتھ کر دیا کہ جو آدمی کل آیا تھا وہ عارضی تھا۔ مستقل آدمی آج آرہا ہے۔ ملازم رکھنے والوں نے شام کو اسی دوست کو کہلا بھیجا کہ صاحب! وہ آدمی جو کل آیا تھا۔ بڑا ہوشیار تھا۔ بہتر ہو کہ اسے ہی بھجوا دیا جائے۔ بمشکل انھیں سمجھایا کہ یہ ڈرامہ کیا تھا! سلیم! دل پہ ہاتھ رکھ کر سوچو کہ ناز صاحب نے کیا کمال کر دکھایا۔ یہ ہیں سلیم! وہ جوہر جو قوموں کی زندگیاں استوار کرتے ہیں۔ خالی زندہ باد کے نعروں سے کچھ نہیں ہوا کرتا۔

لیکن ان چیزوں کے لئے سلیم! بچپن کی تربیت نہایت ضروری ہے۔ اسی کا نام اسلامی ماحول ہے تمہیں تربیت کا ایک واقعہ سناتا ہوں جنہوں کے آ! ا سرفراز صاحب! کو تم جانتے ہو۔ یہ بڑے ٹھ قسم کے مسلمان ہیں۔ پرسوں شام میں ان کے ہاں بیٹھا تھا۔ باپ بیٹا کھانا کھا رہے تھے کہ اتنے میں باہر سے سائل نے پکارا کہ بابا! اللہ کے نام پر کچھ! دسترخوان پہ کچھ روٹیاں تازہ تھیں۔ کچھ صبح کی باسی۔ بچے نے باسی روٹی اٹھائی اور ملازم سے کہا کہ جاؤ فقیر کو دے آؤ۔ باپ نے کہا کہ نہ بیٹا! باسی نہیں۔ تازہ روٹی اور عمدہ سالن۔ اللہ میاں کا فرمان ہے کہ ہماری راہ میں وہ کچھ دو جو تمہیں سب سے زیادہ محبوب ہو۔ میں نے کہا کہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ یہ اللہ میاں کا فرمان ہے؟ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ سرفراز صاحب امی تو ایک طرف۔ ناظرہ قرآن شریف بھی نہیں جانتے اور میں نے بھی یونہی بات سے بات نکالنے کو کہہ دیا تھا۔ کہنے لگے کہ ابھی سنا ہوں مجھے کیسے معلوم ہے؟

کھانا کھا چکے تو حسب معمول حقہ سامنے آیا۔ ایک لمبا سا کش کھینچا۔ نگاہوں کو سامنے دیوار پر جمایا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اور کہا ہاں سنو۔ مجھے کیسے معلوم ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ کہنے لگے۔

بچپن میں عسرت اتنی تھی کہ سال بھر عید کا انتظار محض اس لئے کیا جاتا تھا کہ اس دن پیٹ بھر کر کھانا تو ملیگا گداؤں کی سی زندگی۔ گھر میں ویرانی (اس لئے کہ ماں کا سایہ بچپن سے اٹھ چکا تھا) افلاس کا یہ عالم۔ پاس ہی چچا کا گھر جس میں خدا کا دیا سب کچھ۔ لیکن یہاں باپ کی تربیت نے یہ رنگ پیدا کر رکھا تھا کہ کیا مجال جو کبھی تصور میں بھی نگاہ ان کی طرف اٹھ جائے۔ معلوم ایک دن کیا ہوا کہ ان کے ہاں سے ہمارے ہاں دو بڑے بڑے خوش رنگ کاشمیری سیب آگئے۔ ابا جی کام کو جا چکے تھے۔ گھر میں اکیلا میں ہی تھا۔ بس یوں سمجھو کوئی چھ سات برس کی عمر۔ زندگی بھر میں سیب کی شکل پہلی مرتبہ دیکھی! کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہے۔ لیکن اس کا رنگ اس قدر جاذب اور اس کی خوشبو

ایسی دلکش تھی کہ یہ مجوبۂ روزگار شے دن بھر میری توجہات کا مرکز بنی رہی۔ بس یوں سمجھو۔ جیسے کولمبس کو دور سے کسی نئی دنیا کا ساحل نظر آ جائے۔ دن بھر عالمِ خیال ہی اس کے ذائقہ سے لذت اندوز ہوتا رہا۔ گھڑیاں گن گن کر شام کی۔ کہیں کھیلنے بھی نہیں گیا۔ ادھر ادھر نہیں سرکا۔ شام کے جھٹپٹے میں اباجی واپس آئے۔ اس خوشی سے کہ اب وہ نئی دنیا جو اس وقت تک صرف مجموعۂ رنگ و بو تھی۔ اب وجہ لذتِ کام و دہن بھی ہوگی۔ اچھل کر ان کا استقبال کیا۔ حقہ بھر کر سامنے رکھا اور اب اس انتظار میں ان کے قریب آ بیٹھا کہ ان کی توجہ میری دنیائے آرزو کی طرف مبذول ہو جائے۔"

یہاں پہنچ کر سرفراز بھائی نے ایک زور کا کش لگایا اور پھر نگاہیں دیوار پر جمادیں۔ بات تو چھوٹی سی تھی لیکن اس کی کشش کچھ ایسی تھی کہ میں اس کا انجام معلوم کرنے کے لئے ہمہ تن گوش تھا۔ انھوں نے کہا۔

"ہاں تو میں انتظار میں بیٹھا تھا کہ باہر سے سائل نے آواز دی۔ کہ بابا! بھوکا ہوں خدا کے نام پر کچھ۔ اباجی نے کہا بیٹا! کچھ ہو تو اس محتاج کو دے دو۔ اس کی آواز میں بڑا درد بھرا ہے۔ حاجت مند معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کہہ گئے تھے کہ آپ نے شام کو کھانا نہیں کھایا۔ میں نے صبح کی روٹی سہ پہر کو کھالی تھی اب تو آدھی روٹی کے قریب پڑی ہوگی۔ وہ بھی صبح کی باسی۔ انھوں نے کہا کہ بیٹا! آدھی روٹی اور وہ بھی باسی! یہ تو کچھ ٹھیک نہ ہوا۔ اللہ میاں کا حکم ہے کہ ہماری راہ میں سب سے عمدہ چیز دیا کرو۔ یہ کہا اور دونوں سیب اٹھا کر فرمایا کہ لو! یہ سیب فقیر کو دے آؤ۔ ہمیں اللہ کبھی پھر دے گا۔ یہ محتاج خوش ہو جائے گا۔"

یہ کہا اور سرفراز کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگ گئے۔ حقہ کا ایک اور کش لگایا اور کہا کہ

"میں اٹھا اور اپنی تمناؤں کی پوری کی پوری کائنات جس کی خوشی میں صبح سے شام کی تھی۔ جسے عمر بھر میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور اپنے حالات کے پیش نظر۔ دوبارہ دیکھنے کی توقع بھی نہ تھی۔ فقیر کی جھولی میں ڈال آیا۔ اس دن سے آج تک یاد ہے کہ خدا کا یہ حکم ہے کہ میری راہ میں وہ کچھ دیا کرو جو تمہیں سب سے زیادہ مرغوب ہو۔"

سلیم! دیکھا تم نے مسلمانوں کے گھرانوں میں بچوں کی تربیت کیسے ہوا کرتی تھی۔ لیکن

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

اب نہ گھروں میں وہ تربیت نہ مدرسوں میں وہ تعلیم۔ نتیجہ اس کا میرے اور تمہارے سامنے!

یہ خط یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ایک اور ایسا واقعہ سامنے آ گیا جس کا تذکرہ برابر محل ہے۔ ابھی کوئی گھنٹہ بھر ہوا ہوگا دو آدمی ملنے کے لئے آئے معمولی حیثیت کے سیدھے سادے سے مسلمان۔ ایک نے کہا کہ ہم ایک معاملہ میں فیصلہ

لینے کے لئے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ بھائی! میرا منصب مفتی کا نہیں۔ فتوے لینا ہو تو شہر میں کسی مفتی صاحب کے پاس جائیے۔ اس نے کہا کہ ہم قرآن کا فیصلہ لینے کے لئے آئے ہیں۔ فتویٰ پوچھنے کو نہیں آئے (اس پر میں ذرا ٹھٹکا کہ یہ سطحی نہیں۔ کچھ گہرے مسلمان معلوم ہوتے ہیں) میں نے کہا کہئیے۔ کیا معاملہ ہے۔ اس نے کہا کہ کچھ عرصہ ہوا ہم دونوں کے درمیان ایک معاملہ زیر بحث تھا۔ میرا کچھ کاروبار تھا اور میں چاہتا تھا کہ یہ بھائی صاحب اس میں شریک ہو جائیں۔ کئی دنوں تک آپس میں گفتگو ہوتی رہی۔ مخالف اور موافق دلائل ایسے تھے کہ ہم خود کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہاں کوئی تیسرا آدمی ایسا نہ تھا جس سے مشورہ لیتے ہم اسی کشمکش میں تھے۔ ایک رات ہم دونوں نے خدا سے دعا کی کہ یا اللہ! معاملہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ تیرا حکم ہے کہ تیری کتاب سفر زندگی میں راہ نمائی کرتی ہے۔ ہم اسی کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو فیصلہ یہ کتاب دے گی۔ ہمارے لئے قول ناطق ہوگا۔ دعا مانگی اور قرآن کریم کو کھولا۔ جو آیت سب سے اوپر سامنے آئی اس سے یہی مطلب نکالا کہ اس معاملہ میں شرکت انسب ہے اور یہ فیصلہ دونوں نے بلا حیل وحجت اپنے اوپر نافذ کر لیا۔

سلیم! کتاب اللہ سے استشہاد واستصواب کے اس طریق سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن تم دیکھتے ہو کہ اس کی تہ میں جذبہ کس قدر صادق کام کر رہا تھا۔ یہ فیصلہ کہ۔ یا اللہ! تیری کتاب جو حکم دے گی۔ ہم پر ناطق ہوگا۔ اور پھر اس فیصلہ پر اس طرح بلا تنقید عمل کتنے بڑے پختہ ایمان کی شہادت ہے۔ کیوں؟ غور کرو! تمہارے اس اونچے طبقہ میں ایسے کتنے ہیں جو معاملات زندگی میں خدا کی کتاب کو حکم مان کر اس سے فیصلہ طلب کریں اور پھر اس فیصلہ پر بلا جرح وتنقید کاربند ہو جائیں! ان کی نگاہیں ہر چہار طرف اٹھیں گی لیکن اگر نہیں اٹھیں گی تو کتاب اللہ ہی کی طرف! ان "دنیاداروں" کو چھوڑو۔ ذرا "دینداروں" کے گوشوں میں بھی محتسبانہ نگاہ ڈالو۔ اور ڈھونڈو کہ وہاں بھی اس مسلک کے کاربند کتنے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سادہ دل مرد مسلمان اپنی داستان بیان کر رہے تھے اور میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

انھوں نے کہا کہ اس کے کچھ عرصہ بعد اس دوسرے شریک معاملہ نے ایک کتاب میں دیکھا کہ قرآن مجید سے اس طرح احکام حاصل کرنا فال لینا ہے اور یہ درست نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس سارے معاملہ کا دارومدار تو محض اسی بنیاد پر تھا کہ اس نے قرآن کریم کے اس حکم کو حکم خداوندی سمجھ لیا تھا اور اس سے انحراف کو معصیت خیال کیا تھا۔ اب جو یہ واضح ہو گیا کہ وہ طریق ہی غلط تھا تو اس غلط بنیاد پر جتنی عمارت قائم ہوگی۔ وہ بھی غلط ہوگی۔ لہذا فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ اس شخص کے لئے اس معاہدہ کی پابندی لازمی ہے جو اس حکم قرآن (یعنی فال) کے ماتحت استوار کیا گیا تھا۔ یا وہ اسے توڑ سکتا ہے؟

یہ دوسرا قدم تھا۔ یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ فلاں فیصلہ جسے قرآنی سمجھتے تھے درحقیقت قرآنی نہ تھا۔ تو اس

انکشافِ حقیقت کے بعد فوراً یہ تجسس ہوئی کہ کسی قرآن جاننے والے سے صحیح فیصلہ لیا جائے۔ یعنی رجوع پھر کتاب اللہ کی طرف ہی ہے۔ سوچو سلیم اِکتنے لوگ۔ ایسے ہیں کہ جن پر جب یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان کی فلاں روش قرآن کے خلاف ہے تو وہ اسے اس طرح چھوڑنے پر آمادہ۔ اور صحیح قرآنی روش کے معلوم کرنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہو جائیں گے۔ ایمان کی یہ شان کچھ انہی سادہ لوح مسلمانوں ہی کا حصہ ہے۔

یقیں سادہ دلاں بہ زنکتہ ہائے دقیق

میں نے انھیں بات سمجھانی چاہی تو اس شخص نے جس نے پہلے گفتگو شروع کی تھی۔ مجھ سے کہا کہ چونکہ آپ نے فیصلہ دینا ہے اس لئے ضروری ہے کہ معاملہ کا ہر پہلو آپ کے سامنے آجائے۔ اگرچہ اس سے پہلے میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ راز زیادہ عام ہو جائے۔ اب میں نے زیادہ توجہ سے سننا چاہا کہ وہ کیا کہتا ہے اس نے کہا۔

"میں ایک عرصہ سے مسلمانوں کی مختلف تحریکوں کا بغائر مطالعہ کرتا چلا آرہا ہوں" میں اس کے اور قریب ہو گیا۔ کہ یا اللہ۔ ان بوسیدہ سے کپڑوں میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے۔ اس نے کہا۔

"میں اس مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ تجارت ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مسلمانوں کے اندر احساسِ زندگی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ افلاس ہزار عیب کا ایک عیب ہے۔ اور یہ مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ہر شعبہ پر عذاب الٰہی بن کر مسلط ہے۔ میں نے یہ سوچا کہ جب "تھامس کک" کی فرم کی شاخیں دنیا کے ہر بڑے شہر میں کھل سکتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی ایسی فرم کامیاب نہ ہو سکے۔ میں نے ایسے لوگوں کی تلاش شروع کی جنھیں کاروبار میں کچھ تجربہ یا ملکہ ہو۔ اور یہ دیکھا کہ ایسے لوگ تو موجود ہیں لیکن عام طور پر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے کاروبار نہیں کر سکتے۔ میں نے متمول طبقہ کو دیکھا کہ وہ اول تو اپنا روپیہ تجارت میں لگاتے ہی نہیں اور اگر لگاتے ہیں تو کام کرنے والوں کا خون چوسنے کی غرض سے۔ میں ایک عرصہ تک ان معاملات پر غور کرتا رہا اور بالآخر ایک فیصلہ کر لیا۔"

میں مضطرب تھا کہ سنوں کہ وہ فیصلہ کیا تھا۔ اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں ایک غریب آدمی ہوں۔ مختصر سا ذریعہ آمدنی ہے۔ لیکن میں نے سوچا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ میرا گذارہ اس سے کہیں کم میں ہو سکتا ہے جتنا میں کماتا ہوں۔ اور میں اس سے زیادہ بھی کما سکتا ہوں۔ میں نے اپنے اخراجات کو کم کرنا شروع کیا اور اس طرح کچھ عرصہ میں تھوڑا سا روپیہ جمع کر لیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے اللہ سے یہ عہد کیا کہ یا اللہ یہ روپیہ اور اس کے بعد جتنا کچھ فاضلہ تیری طرف سے عطا ہوگا۔ تمام کا تمام۔ تیری راہ میں اس کاروبار پر صرف کر دوں گا جس قدر نقصان ہوگا اسے میں اکیلا برداشت کر دوں گا۔ اور جس قدر منافع ہوگا۔ اسے کاروبار کرنے والوں پر تقسیم کر دیا کروں گا

اگر وہ چاہیں تو اپنے منافع کا کچھ حصہ اس کاروبار میں لگادیں اور اس پر الگ منافع لے جائیں۔ لیکن میں بہر حال اسے بڑھاتا چلا جاؤں گا تاکہ اس کی شاخیں دنیا کے ہر بڑے شہر میں قائم ہو جائیں۔ اور کوئی کاروبار کرنے والا ایسا نہ رہے جو سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے محتاج رہ جائے۔ اس وقت تک میں نے تین مقامات پر شاخیں کھول دی ہیں۔ ابتداً نا تجربہ کاری اور کام کرنے والوں کی نا اہلی اور بے صبری کی وجہ سے نقصان بھی اٹھانا پڑا لیکن میں نے اسے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اور کرتا چلا جاؤں گا۔ کہ کوئی مشکل میرے اس عزم کو توڑ نہیں سکتی اور کوئی مصیبت میرے اس عہد کو جو میں نے اپنے اللہ سے کر رکھا ہے۔ متزلزل نہیں کر سکتی! یہ ہے وہ کاروبار جس میں میرا یہ بھائی شریک ہوا تھا۔"

وہ یہ کہہ رہا تھا اور اس کا چہرہ دمکتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلال۔ اس کی باتوں میں جوش لیکن اس کی پیشانی پر سکون کے آثار دکھائی دے رہے تھے میں یہ باتیں کچھ اس طرح سن رہا تھا جیسے خواب میں ہوں۔ یا کسی افسانہ کا فلم دیکھ رہا ہوں۔

"نقصان کا ذمہ دار میں خود۔ منافع کے مالک کام کرنے والے"۔

میں محو حیرت تھا کہ یا اللہ! یہ کس دنیا کا انسان ہے۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی استعداد عطا فرمائی ہے کہ میں اپنی ضروریات سے زیادہ کما سکتا ہوں۔ میرے نزدیک مختلف انسانوں میں استعدادوں کا فرق اس لئے ہے کہ جن میں زیادہ استعداد ہے وہ اپنی استعداد کے ماحصل کو ان لوگوں کے لئے وقف کر دیں جن میں یا تو استعداد کم اور ضروریات زیادہ ہیں یا استعداد کے بروئے کار لانے کے ذرائع نہیں ہیں میرے خیال میں قدرت کا منشا یہ نہیں ہے کہ زیادہ استعداد والے انسان دنیا سمیٹ کر جمع کرنی شروع کر دیں"

دیکھو سلیم! یہ ان پڑھ سا انسان۔ جسے قرآن کریم پر قطعاً عبور حاصل نہیں اس کی روح سے کس قدر باخبر ہے۔ پھر کہنے لگا:

"لوگوں نے۔ اور بالخصوص میرے گھر والوں نے مجھے پاگل کہنا شروع کر دیا ہے اور اسی سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ میرے مقصد میں زندگی اور کامیابی کے آثار ہیں۔ دنیا میں جب تک انسان اس روش پر چلتا جائے جو دنیا والوں نے وضع کر رکھی ہے۔ عقلمند کہلائے گا لیکن جونہی اس نے عقل سے کام لے کر ان اندھوں کی لاٹھی کو چھوڑا ان کے نزدیک جنونی" "پاگل" قرار پایا"۔

یہ ہیں سلیم! وہ مسلمان جو اس گئے گذرے زمانہ میں بھی ایمان اور عمل کی روشن قندیلیں تہ دامن رکھتے ہیں۔ یہی ہیں وہ جن کی زندگی کا ہر لمحہ پکار پکار کر کہہ رہا ہوتا ہے۔ کہ

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از دو فرد عشق :
سود است در سرم کہ بہ ساماں برابر است

---

(۲)

اب تمہارا ۲۰ جولائی کا خط میرے سامنے ہے۔ سورۂ فیل کے صحیح مطالب سمجھنے میں جو دقت تمہیں پیش آرہی ہے وہ عام ہے تمہیں سے مختص نہیں ہے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ابابیلوں نے چھوٹی چھوٹی کنکریاں۔ پنجوں اور چونچوں میں اٹھا کر پھینکیں۔ یہ کنکریاں سوار کے سر میں گھس کر ہاتھی کے پیٹ سے نکل جاتی تھیں یوں وہ تمام فوج تباہ کر دی گئی۔ اس مفہوم کی علّت یہ ہے کہ اس سورۂ مقدسہ کے ایک لفظ ترمیہم کا غلط مفہوم سامنے آگیا جس پر غلط روایات کی عمارت قائم ہو گئی۔ اور یہی روایات رواج پذیر ہو گئیں۔ اسی ایک لفظ کے مفہوم کی درستی سے سارا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ تل کی اوٹ میں پہاڑ ہے۔ جزئی تفاصیل میں جانے کے بغیر یوں سمجھو کہ اہل مکہ کی ایک مخالف قوت (ابرہہ) نے یہ پلان کیا کہ قریش پر حملہ کیا جائے لیکن اس انداز سے کہ حملہ اچانک ہو اور قریش کو بے خبر جا پکڑا جائے۔ چنانچہ اس کے لئے اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا مکہ تک آپہنچے اور فوج کے مہیب ہاتھی انہیں کچل ڈالیں۔ یہ تھی اس کی خفیہ تدبیر (کید)۔ اس تدبیر کے مخفی رکھنے کے لئے اس نے پورا پورا اہتمام کر لیا لیکن مشیت کا منشاء اہل مکہ کو بچانا تھا۔ اس لئے اس مہم میں ایک ایسی کڑی ساتھ جا لگی جس سے یہ تمام اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی جس زمانہ میں اردو اور ہم زمین کے ساتھ آسمان کو بھی آتش زار نہیں بنایا کرتے تھے۔ بڑے بڑے لاش خور پرندے مثل گدھ چیل۔ فوجوں کے ہمراہ ہو جاتے۔ جونہی کوئی فوج نقل و حرکت کرتی یہ اپنی خداداد فراست سے اندازہ کر لیتے کہ اب رزق کا سامان پیدا ہونے لگا ہے۔ ہاتھیوں والی فوج نے اپنی نقل و حرکت کو اہل مکہ سے چھپائے رکھا لیکن ان پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ (طیراً ابابیل۔ ابابیل کے معنی جھنڈ کے جھنڈ ہیں۔ نہ کہ وہ ابابیلیں جو سر شام ہمارے ہاں اڑتی پھرا کرتی ہیں) اس فوج پر منڈلاتے ہوئے ساتھ ہو لئے اور یوں زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا۔ اہل مکہ جانتے تھے کہ اس قسم کے پرندوں کی ایسی پرواز کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ وہ اس دھوئیں سے نیچے کی آگ کا پتہ پا گئے۔ اور پہاڑیوں پر چڑھ کر ایسا پتھراؤ کیا کہ فوج کا ہاتھیوں سمیت بھرکس نکل گیا۔ قرآن کریم نے اہل مکہ کو اس واقعہ کی یاد دلائی ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ اسلام دنیا بھر کے نظریات کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ قریش کو یہ خوف بھی دامنگیر تھا کہ اگر ہم نے اسلام قبول کر لیا تو اردگرد کی تمام قوتیں ہجوم کر کے آجائیں گی۔ اور کچل ڈالیں گی۔ ان کا یہ

خوف دور کرنے کے لئے ایک ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ابھی کل تک آنکھوں کے سامنے رونما ہوا تھا۔ ان سے کہا گیا کہ جس خدا نے یہ انتظام کر دیا تھا کہ ایسی مہیب فوج کی خفیہ تدبیریں خاک میں ملا دے۔ کیا وہ تمہیں ان مزعومہ خطرات سے محفوظ نہ رکھ سکے گا؟ (سورۂ فیل سے اگلی سورت میں قریش پر خدا کے انہی انعامات کا ذکر ہے)، اس تصریح کے بعد اس سورت کی آیات پر نگاہ ڈالئے۔ بات واضح ہو جائے گی۔ فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝

کیا تم نے (اے قریش) نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا ان کی (مخفی) تدبیر کو اس نے بیکار نہیں کر دیا تھا؟ یعنی ان پر فوج در فوج پرندے بھیج دیئے۔ تم نے ان پر پتھراؤ کیا۔ آخر انہیں ایسا کر دیا جیسا کھانے کا بھس۔

ترمیھم[1] کے معنی یہ لئے گئے کہ پرندوں نے ان پر پتھراؤ کیا۔ اور اسی تل کی اوٹ میں سارا پہاڑ چھپ گیا۔ حالانکہ اس کے معنی صاف ہیں کہ تم نے ان پر پتھراؤ کیا امید ہے اب بات واضح ہو گئی ہو گی۔

---

(۳۲)

۱ جولائی کے خط میں تم نے حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے جس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کا مطلب سمجھنے سے پیشتر دو لفظ بطور تمہید سن لینے ضروری ہیں۔ علامہ اسلم صاحب قبلہ نے اپنے ایک مضمون "ختم نبوت" میں ضمناً یہ تحریر فرمایا تھا کہ مسلمانوں میں ایک آنے والے کے غلط عقیدہ نے یہ تمام خلفشار پیدا کر رکھا ہے جب تک مسلمان اس دروازہ کو بند نہیں کرتے۔ مدعیان کا راستہ نہیں رک سکتا اور نہ ہی مسلمان خود ابھر سکتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ اس قسم کے آنے والے کے عقیدہ کے تو مخالف تھے جو مسلمانوں میں بالعموم رائج ہے۔ لیکن وہ قوم کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک مومن (فرد یا جماعت) کے وجود کو ضروری سمجھتے تھے جو ان کے عالم افکار میں زلزلہ اور ان کی خفتہ قوتوں میں ہیجان پیدا کر دے۔ اس لئے ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں سے آنے والے کے عقیدہ کو مٹانے کے بجائے اس غلط عقیدہ کی

---

[1] یہ بحث تفصیل طلب ہے کہ واحد مخاطب کے صیغہ سے مراد جمع مخاطب کیسے لی گئی ہے۔ لیکن ہے یہ قاعدہ کے مطابق۔

اصلاح کی جائے جو ان میں رواج پذیر ہو چکا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس خیال کو اس نظم میں ظاہر فرمایا جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے اور جو ضرب کلیم میں مہدی کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ جس میں آپ فرماتے ہیں۔

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف ‏ یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغ چمن کو!

مجذوب فرنگی نے باندازِ فرنگی ‏ مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار ‏ نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

ہو زندہ کفن پوش تو میت اسے سمجھیں

یا چاک کریں مردکِ ناداں کے کفن کو

آخری شعر کے سمجھنے میں تمہیں مشکل پیش آرہی ہے کہ تم متعین نہیں کر سکتے کہ اس میں اشارہ کس کی طرف ہے۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ آنے والے کا عقیدہ قوم میں زندگی کا خون دوڑانے والا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے اس زندگی بخش عقیدہ کو توہم پرستی کا کفن اوڑھا کر اسے بالکل مردہ بنا دیا ہے۔ اب صاحب نظر کا کام یہ ہے کہ توہم پرستی کے اس کفن کو چاک کرکے، اندر سے زندہ لاش کو اٹھا کر کھڑا کر دے۔ نہ یہ کہ اسے سچ مچ مردہ سمجھ کر دفن کرنے کی تلقین کردی جائے! حضرت علامہ اقبالؒ اس عقیدہ کو نقطۂ ایک عظیم الشان مقصد کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں اور بس۔

"آنے والے" کے متعلق اپنے خیالات میں اپنے مضمون "ختم نبوت" میں ظاہر کر چکا ہوں بہتر ہو کہ وہ مضمون۔ اور علامہ اسلم صاحب قبلہ کا مضمون ایک مرتبہ پھر دیکھ لو۔

سلیم۔ یہ خط بہت لمبا ہو گیا۔ باقی پھر سہی۔ نجات کے متعلق اپنی اولین فرصت میں لکھوں گا۔ انشاء اللہ۔ کتابیں فارغ ہو چکی ہوں تو بھیج دینا۔ ‏ والسلام

پرویز

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۸) پہلے ان شبہات کو لیا جو قسموں کے متعلق عام طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان شبہات کے متعلق ان جوابات کو پرکھا جو متقدمین کی طرف سے دیئے گئے ہیں اور انکی خامیوں پر عالمانہ تنقید فرمائی اسکے بعد اپنے تدبر فی القرآن کے نتائج پیش کئے یہ رسالہ عربی زبان میں تھا اسلئے اس کی افادیت کا حلقہ محدود تھا۔ اب مرحوم کے لائق شاگرد جناب امین احسن صاحب اصلاحی نے اسکا اردو میں ترجمہ کر دیا ہے جسے دائرۂ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ نے شائع کیا ہے۔ جناب اصلاحی صاحب ترجمہ خوب کرتے ہیں یہ رسالہ چھوٹی تقطیع کے ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور بلا جلد قیمت ۸ر ہے جو ان لوگوں کیلئے جو کتابوں کو نگاہ کے میزان میں تولتے ہیں، زیادہ نہیں۔

نقد و نظر

(۱) آثار جمال الدین افغانی

مرتبہ قاضی عبدالغفار صاحب۔ شائع کردہ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۲۰۰ صفحات۔ متعدد تصاویر و عکس خطوط جناب سید صاحب طباعت کتابت اچھی۔ کتاب پر قیمت درج نہیں ہے۔

فرزند توحید بطلِ عظیم سید جمال الدین افغانی علیہ الرحمتہ کی ہستی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی ذات گرامی ان مایۂ ناز ہستیوں میں سے ہے جو تو موں کے عروق مردہ میں خونِ زندگی دوڑانے کے لئے سب کچھ قربان کر دیا کرتی ہیں۔ افسوس یہ تھا کہ ایسی معروف ہستی کے کوائفِ حیات و تفصیلات اب تک تمام تر مسلمانوں کے سامنے نہ آسکے۔ اس باب میں اردو میں دو چار چھوٹے چھوٹے پمفلٹوں کے علاوہ اور کچھ دیکھنے میں نہ آیا۔ خوشی ہوئی کہ جناب قاضی عبدالغفار صاحب نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور ایک ایسی کتاب مرتب فرما دی جس نے بڑی حد تک اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ کتاب میں وہ سب کچھ موجود ہے جسے دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی تھیں۔ ایک بات البتہ قابلِ افسوس ہے۔ تاریخ کے مرتب کے لئے ضروری ہے کہ وہ کوئی اپنا خاص خیال سامنے رکھ کر اسے ترتیب نہ دے بلکہ واقعات و حوادث کو تمام و کمال پڑھنے والے کے سامنے رکھدے تاکہ وہ آزادانہ کسی نتیجہ پر پہنچ سکے لیکن جناب قاضی صاحب نے اس کتاب کو ایک خاص خیال کے ماتحت مرتب کیا ہے اور وہ خیال ہے وطنیت اور قومیت پرستی چنانچہ وہ کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

> جیسا کہ ناواقف لوگ سمجھتے ہیں انھوں نے یعنی سید جمال الدین نے اپنی تحریک میں وطنیت اور قوم پرستی کے عناصر کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا۔ اس بحث کے ہر پہلو کو پیش کرنے کے لئے ایک مکمل کتاب لکھنی پڑے گی لیکن جو لوگ آثار جمال الدین کے مختصر اوراق کا بغور مطالعہ کریں گے ان کو معلوم ہو سکے گا کہ شیخ اپنی تحریک اتحادِ اسلامی میں مسلمان اقوام کی ملی اور قومی وحدتوں کو محو کر دینا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ہر وحدت کو بجائے خود وطنیت کے جذبہ پر مستحکم کر کے ان کا ایک ایسا وفاق بنانا چاہتے تھے جو یورپین امپیریلزم کی دراز دستی کا مقابلہ کر سکے!

یہی نقطۂ نگاہ ہے جو ساری کتاب میں پیش نظر رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے کتاب سیرت جمال الدین کے بجائے

قومیت پرستی کی وکیل بنتی چلی گئی ہے۔ ویسے کتاب بڑے سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے اور اہلِ ذوق کے لئے اس میں کافی مسالہ جمع کر دیا گیا ہے۔

(۲) بقول زردشت

جرمنی کے مشہور فلاسفر۔ نیٹشے کا نام پہلے کسی نے سنا ہو یا نہ لیکن حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں اس انداز سے اس کا تعارف کرایا ہے کہ اس کے بعد ہر شخص کا جی چاہتا ہے کہ اس مجذوب فرنگی کے متعلق مزید معلومات حاصل کی جائیں اور اس کے نظریۂ زندگی سے واقفیت حاصل کی جائے نیٹشے بہت سی کتابوں کا مصنف ہے لیکن اس کی ساری زندگی کا آئینہ اور تمام تعلیمات کا لب لباب اس کی مشہور کتاب "بقول زردشت" ہے۔ کتاب کا جناب زردشت (ایرانی) سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ نیٹشے نے اپنی کہانی فرضی زردشت کی زبانی بیان کی ہے۔ نیٹشے عمر بھر وادیٔ حیات میں سرگرداں پھرتا رہا اور آخری عمر میں اس کا دماغی توازن بھی قائم نہ رہا۔ اس کے دل میں تلاشِ حقیقت کے لئے ایک پرجوش تڑپ تھی لیکن وہ فطرت کی سربستہ رموز کو تنہا عقل کی رو سے کھولنا چاہتا تھا۔ اس قسم کی کوشش کا انجام سوائے حیرت و اضطراب کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہی نیٹشے کے ساتھ ہوا۔ اگر اس کے سامنے آسمانی روشنی کی کوئی کرن آ جاتی تو اس کی حیرت ایمان سے اور اس کا اضطراب سکون سے بدل جاتا ایسا سکون جو بصیرت ایمانی سے اور ادراکِ حقیقت کے بعد پیدا ہوا کرتا ہے لیکن نیٹشے کو یہ کچھ میسر نہ آ سکا۔ اور وہ اضطراب و حیرت کی وادیوں میں ٹھوکر جہاں سے چلا گیا "بقول زردشت" میں اس کا یہ اضطراب اور حیرت بے اختیار چشموں کی طرح ابل کر سامنے آئی ہے اگر سطحی طور پر دیکھا جائے تو کتاب ایک پریشاں خیال۔ وحشت زدہ مجذوب کی بڑ نظر آتی ہے لیکن اس کی گہرائیوں میں اتر کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ پریشانیٔ افکار کیوں ہے۔

اصل کتاب جرمن زبان میں ہے جس کا ترجمہ جناب ڈاکٹر ابو الحسن منصور احمد صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بڑے سلیقہ سے کیا ہے۔ ترجمہ میں کتاب کی عبارت تو سلیس اردو میں سامنے آگئی ہے۔ لیکن نیٹشے کے خیالات ایسے ہیں کہ ان کا سمجھ لینا ہر عامی کے بس کی بات نہیں۔ اس کتاب کے ترجمہ سے جناب منصور احمد صاحب اور اس کی اشاعت سے انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے اردو دان طبقہ پر احسان کیا ہے فلسفہ سے ذوق رکھنے والے احباب اس سہل تصنیف سے فائدہ اٹھائیں گے۔ طباعت۔ کتابت عمدہ - ۴۲۳ صفحات۔ قیمت اس پر بھی درج نہیں

(۳) سیاستِ ملیہ

مرتبہ محمد امین زبیری مارہروی مطبوعہ عزیزی پریس۔ آگرہ ضخامت پانچ سو صفحات۔ طبع و کتابت اچھی۔ کاغذ معمولی۔ مجلد کی قیمت (دو روپیہ آٹھ آنہ) ۔

مسلم لیگ کے نشاۃ ثانیہ کے بعد سے مسلمانانِ ہند میں ایک خاص بیداری کے آثار نظر آرہے ہیں جس سے قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ متاثر ہو رہا ہے اور جس کی وجہ سے اس طبقہ کی طرف سے وقتاً فوقتاً مسائل حاضرہ کے متعلق اچھی اچھی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک عمدہ کڑی ہے۔ اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے لیکر پنجاب پراونشل فیڈریشن کے اجلاس (منعقدہ مارچ ۱۹۴۱ء) تک مسلم سیاست کے مد و جزر کی اجمالی تاریخ ہے جسے نہایت محنت سے مرتب کیا گیا ہے یہ کتاب مسلمانانِ ہند کی بڑی ضرورت کو پورا کرے گی۔ اکثر مقامات پر بغرض وضاحت مختلف اقوام و ملل کے سیاسی مشاہیر اور مسلم لیگ کے صدر صاحبان کے خیالات اور آراء کے اقتباسات شرح و بسط سے دئے گئے ہیں جن سے کتاب کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔ کہیں کہیں عبارت میں ژولیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ اور بعض جگہ کتابت کی غلطیاں بھی ہیں جس کے لئے اخیر میں اغلاط نامہ لگا دیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی کتاب مفید ہے۔ اور جناب مؤلف کی محنت قابلِ داد ۔

---

(۴) اسلام و مسیحیت

مناظرہ کے میدان میں جناب ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری (ایڈیٹر اہلِ حدیث) کا نام کس نے نہیں سنا۔ آپ کی ساری عمر غیر مذاہب اور دیگر فرقِ اسلامیہ کے ساتھ مباحثوں اور مناظروں میں گذری ہے۔ بالخصوص آریہ۔ عیسائی اور قادیانی حضرات تو ان کی یاد سے کبھی نہیں اترتے۔ موجودہ کتاب پادری برکت اللہ صاحب کی تین کتابوں۔ توضیح القرآن مسیحیت کی عالمگیری اور دینِ فطرت کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ اور عیسائیت کے متعلق جناب مصنف کے عمر بھر کے مطالعہ کا نچوڑ ہے انھوں نے خود شروع میں لکھا ہے

"میں بتوفیق باری تعالیٰ اپنی عمر طبعی کو پورا کر چکا ہوں۔ میری عمر کی یہ آخری منزل ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی اور کسی اور کتاب کا تصنیف کرنا میرے لئے مقدر ہے یا داعیٔ اجل کو لبیک کہنے کا وقت آگیا ہے"

اس لئے مناظرانہ مباحث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس کتاب کی قدر کرنی چاہئے۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات طبع و کتابت کاغذ معمولی قیمت (بلا جلد) ۱۲ر جو زیادہ معلوم ہوتی ہے ۔

ملنے کا پتہ

دفتر اہلِ حدیث امرتسر

(۵) **تمدنِ اسلام** انجمن اسلامی تاریخ و تمدن۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے تبلیغِ افکار کا ایک نہایت عمدہ سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ اربابِ انجمن وقتاً فوقتاً ملتِ اسلامیہ کے نامور اہلِ فکر و نظر کو دعوت دیتے اور ان سے طلباء اور اساتذہ کے مجامع میں مختلف موضوعات پر خطبات پڑھواتے ہیں۔ ان مقالات کو بعد از اں پمفلٹوں کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ زیرِ نظر پمفلٹ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ مقالہ جناب عبد الماجد صاحب دریا بادی نے اگست ۱۹۵۰ء میں پڑھا تھا جس میں تمدن اسلام کا پیام بیسوی صدی کے نام۔ خود تمدنِ اسلام کی زبان سے دیا گیا ہے۔ جناب عبد الماجد صاحب اردو انشاء پردازی میں ایک خاص رنگ کے مالک ہیں اور وہی رنگ اس پیام میں بھی نمایاں ہے لیکن مذہبیات میں ان کا رنگ اس سے بھی الگ رہا ہے اور وہ ایک مثال سے واضح ہو سکتا ہے۔ اسلامی مساوات اور سادہ زندگی کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں۔

"دو واقعات ملتے جلتے ہوئے عہدِ زرین کے اور سنتے چلئے۔

غزوۂ تبوک میں سامان رسد کی کمی پڑ گئی اور صحابہؓ بھوک سے نہایت پریشان ہوئے خیال تھا کہ اونٹ ذبح کئے جائیں۔ اس پر جبح ہوئی کہ معرکۂ جنگ میں سواریاں بھی تو اہم چیزیں ہیں بالآخر آپ نے یہ کیا کہ ہر شخص کے پاس سے اس کا بچا ہوا سامانِ رسد طلب فرمایا۔ کوئی کم لایا کوئی زیادہ۔ ایک چادر پر اکٹھا کر کے آپ نے اس پر دعا کی برکت فرمائی اور پھر سب کے کہا کہ اپنے اپنے برتن اس مجموعہ سے بھر لیں۔ راویوں کا بیان ہے کہ سب نے اپنے اپنے برتن بھر لئے اور خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور سامان پھر بھی بچ رہا۔ اسی طرح ایک اور سفر میں جب آپ کے سامان رسد میں نمایاں کمی اور صحابہؓ میں بھوک کی بیتابی۔ بھی تو سب کا زادِ راہ ایک چادر پر ڈھیر کرالیا اس نے کل اتنی جگہ گھیری کہ اس پر ایک بکری بیٹھ سکے اور اشخاص کی تعداد ۱۴۰۰۔ لیکن اس پر بھی سب لوگوں نے سیر ہو کر کھالیا اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لئے (سیرۃ النبی جلد ۳ ص ۴۴۰ ملخصاً)

محدثین نے تو ان واقعات کو کتاب الایمان وغیرہ کے ماتحت درج کیا ہے اور انھیں معجزاتِ نبوی میں شمار کیا ہے۔ معجزہ تو نبی کی ایک ایک بات تھی لیکن میں کہتا ہوں کہ صحیح کمیونزم کی کمال ان واقعات سے کہیں فربہ کرے گی! (ص ۱۵-۱۶)

ہم نہیں سمجھ سکے کہ کمیونزم سے متاثر یونیورسٹی کے طلباء نے ان واقعات سے کیا سبق حاصل کیا ہوگا؟ ان کے سامنے دورِ حاضرہ کے معاشی نظام کے الجھے ہوئے مسائل ہیں ان کی پریشانی فکر و نظر کو دور کرنے کے لئے ضرورت

اس امر کی ہے کہ ان کے سامنے اسلام کا معاشی نظام رکھا جائے جو اپنے اندر ان تمام مشکلات کا حل لئے ہوئے ہے۔ بجائے اس کے انھیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلام میں کھانے پینے کی اشیاء کی کمی کا علاج معجزات نبوی کے ذریعہ سے کیا جاتا تھا۔ باقی رہا یہ کہ ان مسلمانوں نے جن کا ذکر ان واقعات میں کیا گیا ہے۔ اپنا اپنا کھانا لا کر ایک جگہ رکھ دیا اور پھر اسے سب میں یکساں تقسیم کر دیا تو یہ بھی معاشی مساوات کی صحیح مثال نہیں ہے۔ میدان جنگ یا سفر میں ایسے حالات کے ماتحت۔ امیر ملت کے حکم سے ہر جگہ ایسا ہی ہوگا۔ اسلامی مساوات کے لئے سینکڑوں برجستہ مثالیں ایسی مل سکتی ہیں جن کے سامنے ہر کمیونسٹ کا سر جھک جائے۔ نوجوان طلباء کے سامنے اس قسم کی مثالیں لانی چاہئیں۔ مقالہ کے آخری حصہ میں فرماتے ہیں۔

> راحت قلب اور سکون خاطر کہاں زیادہ نصیب ہے؟ وہاں جہاں چوبیسوں گھنٹے سنیما اور ٹیلی فون اور گراموفون اور ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر گھنگھناتے رہتے ہیں اور جہاں اخبار فروش ہر لمحہ اپنی روزی کے لئے ایک نیا ہیجان تلاش کرتے رہتے ہیں یا وہاں جہاں کے باشندے قناعت اور صبر و ضبط نفس کے فضائل کے سبق پڑھ چکے ہیں؟ صہ ۲۲

وہی رہبانیت جس نے مسلمانوں کو آج دنیا کی ضعیف ترین قوم بنا رکھا ہے! حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات مذہب پرستی سمجھتے ہی اسے ہیں کہ دور حاضرہ کی ہر ایجاد کی مخالفت کی جائے۔ حالانکہ مخالفت کے قابل یہ ایجادیں نہیں۔ بلکہ وہ نظام ہے جس کے ماتحت ان ایجادات سے غلط کام لیا جاتا ہے۔ سنیما، ٹیلی فون، گراموفون، ریڈیو، لاؤڈ اسپیکر۔ اسمائے فطرت میں سے ہیں جن کے علم سے بہرہ یاب ہونے کے بعد آدم ملائکہ کا مسجود بنا ہے۔ تسخیر فطرت قرآن کا حکم اور مسلمان کا فریضہ تھا جو اس نے بھلا دیا اور اس کا نتیجہ یہ بے برگی کی زندگی ہے۔ بجائے اس کے کہ مسلمان نوجوانوں کو بتایا جائے کہ یہ ایجادات تمہارا کام تھا اور تمہیں ہی کرنا چاہئے تھا۔ انہیں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سب تجربات ممنوعہ ہیں۔ ان کے پاس بھی نہ پھٹکنا۔ دوسری طرف قناعت صبر، ضبط نفس کے غلط مفہوم نے بھی مسلمانوں کو کم نقصان نہیں پہنچایا۔ ضرورت یہ ہے کہ انھیں بتایا جائے کہ ان الفاظ کا اسلامی مفہوم کیا ہے۔ ان دونوں چیزوں کے مجموعہ (یعنی دور حاضرہ کے سائنس کے انکشافات اور قرآنی نظریہ قناعت صبر وغیرہ) ہی سے صحیح اسلام سامنے آسکتا ہے۔ اور اسی اسلام کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ ہم ان حضرات سے عرض کریں گے کہ وہ ان نوجوانوں کو صحیح اسلام سے روشناس کرانے کی کوشش کیا کریں۔ محض طنز اور تعریض سے کچھ نہیں بن سکتا

اے پیر حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ ! — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

اقبالؒ

(٦) ایمان یہ وہ تقریر ہے جو جناب سید سلیمان ندوی صاحب نے انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے زیر اہتمام اسلامی ہفتہ (دسمبر ۱۹۲۵ء) میں فرمائی اور جسے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

ایمان کی حقیقت اور اس کی ضرورت کے متعلق نہایت عمدہ مضمون ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایمان محض ایک نظری شے نہیں بلکہ اس کا زندہ اثر ہماری عملی زندگی پر پڑتا ہے۔ گویا یہ وہ قالب ہے جس میں ہماری عملی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے انداز بیان فلسفیانہ اور طریق استدلال موثر۔

ایک بات سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی مسلمانوں میں عام طور پر یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ ایمان کے اجزا چھ ہیں۔ اللہ ملائکہ کتب۔ رسل۔ تقدیر۔ اور یوم آخرت۔ حالانکہ قرآن کریم میں ایمان کے اجزاء صرف پانچ بتلائے گئے ہیں۔ تقدیر ایک قرآنی مسئلہ ہے۔ اجزاء ایمان میں سے نہیں ہے۔ اسے چھٹا جزو ایمان قرار دینے میں عوام ہی نہیں بلکہ علماء تک بھی شامل ہیں۔ چنانچہ جناب سید سلیمان ندوی صاحب نے سیرۃ النبیؐ جلد چہارم میں اسے چھٹا جزو ایمان قرار دیا اور دیگر اجزاء ایمانیہ کی طرح اس پر بھی ایک الگ باب لکھا۔ جناب حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن کی رو سے ایمان کے اجزاء صرف پانچ ہیں تقدیر ایمانیات میں داخل نہیں۔ اس پر بجائے اس کے کہ اس کھلی ہوئی بات کو تسلیم کر لیا جاتا۔ جناب سید صاحب نے اس کے خلاف بڑی شدومد سے لکھا اور اپنی بات پر جمے رہے (ملاحظہ فرمائیے معارف جلد ۳۳ نمبر ۳) اب رسالہ زیر نظر میں جناب سید صاحب "ایمان کے اجزاء" کے عنوان کے ماتحت فرماتے ہیں۔

"صریح الفاظ میں اس ایمان کے صرف پانچ اصول تلقین کئے۔ خدا پر ایمان۔ خدا کے فرشتوں پر ایمان۔ خدا کے رسولوں پر ایمان۔ خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا و سزا کے دن پر ایمان" (ص ۲۶)

الحمد للہ کہ جناب سید صاحب کو معلوم ہو گیا کہ قرآن کریم نے صریح الفاظ میں ایمان کے صرف پانچ اصول تلقین کئے ہیں۔ حیرت ہے کہ جو چیز قرآن نے ایسے صریح الفاظ میں تلقین کی ہو وہ نہ صرف یہ کہ سیرت النبی کی تصنیف کے وقت ہی سید صاحب کی نگاہوں سے اوجھل ہوئی بلکہ خاص طور پر بتانے پر بھی سامنے نہ آسکی۔ ہمیں امید ہے کہ جناب سید صاحب سیرۃ النبیؐ (جلد چہارم) کے آیندہ ایڈیشن میں اس غلطی کی اصلاح فرما دیں گے۔ جناب حافظ صاحب نے اپنے تبصرہ میں (علاوہ اس ایک مسئلہ کے) اور بھی کئی ایک امور کے متعلق لکھا تھا کہ ان کی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ ہمیں امید ہے کہ اسی طرح رفتہ رفتہ ان کے متعلق بھی یہ حقیقت جناب سید صاحب پر منکشف ہو جائے گی کہ جناب حافظ صاحب کے اعتراضات درست تھے۔

یہ دونوں پمفلٹ (یعنی تمدن اسلام اور ایمان) دیدہ زیب شکل میں شائع کئے گئے اور انجمن اسلامی تاریخ و تمدن

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے دو روپے آٹھ آنہ میں مل سکتے ہیں انجمن اپنے اس کام میں ہر قسم کی اعانت کی مستحق ہے ۔

---

(۷) خطبات جس زمانہ میں جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی - مدیر ترجمان القرآن - کا قیام دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں تھا - وہ وہاں کی مسجد میں جمعہ کو خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے ۔ دارالاسلام پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع میں واقع ہے جہاں مسلمانوں میں جہالت عام ہے ۔ اس لئے ضرورت تھی سید صاحب کو سلیس زبان میں عام فہم مسائل کو بیان کرنا ہوتا تھا - اب انھوں نے ان خطبات کو ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مجموعہ کام کی چیز بن گیا ہے - سید صاحب کی تحریر میں متانت اور طرز استدلال میں سنجیدگی ہوتی ہے یہ خصوصیات ان خطبات میں بھی موجود ہیں جو اسلام کے بنیادیات کے مختلف گوشوں پر مشتمل ہیں - ان کے ساتھ کہیں کہیں وہ غلو اور تشدد بھی موجود ہے جو سید صاحب کے انداز کی ایک اور خصوصیت ہے - خطبات ترجمان القرآن کی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں - کتابت اور طباعت کاغذ نہایت عمدہ - قیمت بے جلد ایک روپیہ چار آنہ محصول ڈاک تین آنہ ملنے کا پتہ دفتر ترجمان القرآن لاہور ۔

---

(۸) دارالاسلام: خاص نمبر طلوع اسلام کے صفحات پر تحریک دارالاسلام کا ذکر کئی مرتبہ آچکا ہے - وہ تحریک جو آخری ایام میں حضرت علامہ اقبالؒ کے تصورات کی آماجگاہ تھی اور جسے مجازی پیکر عطا کرنے کے لئے جناب چودھری نیاز علی خاں صاحب نے اس قدر ایثار فرمایا - جیسا کہ بار بار دیکھا گیا - سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اس تحریک کے لئے کوئی ایسا موزوں آدمی نہیں ملتا تھا جو مرکز میں بیٹھ کر اسے آگے بڑھائے دارالاسلام کے زیر نظر پرچے سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ طالب العلموں کے .... جواں سال جواں ہمت - مولوی جناب مرزا عبدالحمید صاحب ایم - اے - نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا ہے - اس اشاعت خاص میں انھوں نے تحریک کے مقاصد وغیرہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ان تمام خیالات آرا کو یکجا جمع کر دیا ہے جو قرآن کریم کی تعلیم کے بارے میں مختلف مواقع پر سامنے آتے رہے - ارباب ذوق اس رسالہ کو طلب فرمائیں اور مطالعہ کے بعد اس تحریک کے ذمہ دار حضرات کو اپنے مشوروں سے مستفید کریں کہ ایسے کام اسی طرح چلا کرتے ہیں -

ہمیں خوشی ہوئی کہ بالآخر دارالاسلام کی سوئی ہوئی بستی میں حرکت سی کوئی نشان تو ابھرا دارالاسلام ہماری آرزوؤں کا مرکز ہے - اس لئے اس کے ساتھ ہمارا قلبی تعلق ظاہر ہے - ہماری خدمات ہر وقت دارالاسلام کے لئے حاضر ہیں ۔ خدا کرے یہ نیا اقدام استقامت پذیر ہو اور حسنہ نتائج کا مثمر -

(۹) ترجمہ پارہ عم

مکتبہ دار الاسلام میں قرآن کریم کا آیت بہ آیت جدید انداز جاری کیا گیا تھا۔ ایک طرف الفاظ کا اردو ترجمہ سامنے اس عبارت کا بامحاورہ ترجمہ، نیچے مختصر لیکن جامع تفاسیری نوٹ۔ تیسویں پارہ کا یہ ترجمہ مکمل ہو، اور شعبہ اشاعت قرآن۔ ادارہ دار الاسلام نے الگ پیفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا۔

اس ترجمہ کو پڑھا جائے تو نہ صرف قرآنی مفہوم ہی سامنے آ جاتا ہے بلکہ تھوڑے سے عرصہ میں قرآنی عربی پر بھی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کی افادی حیثیت بہت زیادہ ہے۔ بچوں اور بڑوں سب کے لئے مفید۔ ضخامت ۹۰ صفحات، طباعت کتابت، کاغذ عمدہ۔ ہدیہ مرحلہ دار الاسلام میں اب اسی قسم کا ترجمہ پہلے پارہ سے شروع کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس طرح ایک ایک پارہ شائع ہو کر قرآن کریم مکمل ہو جائے گا۔

---

(۱۰) البیان امرتسر

ہم اس سے پیشتر لکھ چکے ہیں کہ امت مسلمہ کے بانی خواجہ احمد الدین مرحوم کا مسئلہ تقسیم وراثت میں تدبر فی القرآن مجتہدانہ انداز لئے ہوئے تھا اس باب میں انھوں نے بہت کچھ لکھا اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحقیق کے خلاف جس قدر اعتراضات وارد کئے گئے تھے ان کے جوابات وغیرہ کو انھوں نے ایک رسالہ کی صورت میں مدون فرمایا تھا اب وہی رسالہ البیان کے خاص نمبر کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ قرآن کریم کے مشکل مقامات کا حل تلاش کرنے والوں کے لئے بالعموم اور مسئلہ تقسیم وراثت کو سمجھنے کے آرزومند حضرات کے لئے بالخصوص مفید ہے۔ رسالہ کے مرتب نے اپنی طرف سے کسی تصرف کو جائز نہیں رکھا لیکن جیسا کہ پہلے گذارش کیا گیا تھا۔ خواجہ صاحب مرحوم کے انداز بیان میں الجھاؤ ہوتا ہے۔ اور بالخصوص فنی مباحث میں بعض مقامات پر بات کچھ مشکل ہو جاتی ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ خواجہ صاحب مرحوم کی تحقیقات قرآنی کو سلیس اور دلکش زبان میں شائع کیا جائے۔ اس سے ان چیزوں کی افادی حیثیت بڑھ جائے گی۔ یہ رسالہ البیان کے سائز کے ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ قیمت فی پرچہ ۱۲ البیان کا سالانہ چندہ ۳/- روپیہ ہے۔ اور دفتر امت مسلمہ امرتسر سے ہر ماہ شائع ہوتا ہے

اقسام القرآن

حضرت علامہ حمید الدین فراہی کی ذات گرامی کا کئی مرتبہ ان صفحات پر تذکرہ آ چکا ہے آپ نے اپنے سلسلہ تفسیر قرآن کریم کے ضمن میں ایک مفید رسالہ امعان فی اقسام القرآن عربی میں لکھا تھا جس میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی تھی کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قسمیں کیوں آئی ہیں جیسا کہ قرآن کریم کے مشکل مقامات میں سے ہے۔ اس لئے اس پر قلم اٹھانا آسان نہ تھا۔ جناب مصنف نے

(بقیہ صفحہ ۷۰)

حقائق و عبر

شاھد من اھلھا

رئیس الاحرار جناب محمد علی صاحب مرحوم نے اپنی انتھک کوششوں سے حضرات علمائے کرام کو ان کی درسگاہوں اور خانقاہوں کے گوشوں اور زاویوں سے نکالا۔ اور سیاست کے میدان میں لا کر جمعیت علماء کی بنا ڈالی۔ ایک مرتبہ سوال پیدا ہوا کہ جمعیت کے کسی سالانہ اجلاس کا صدر جناب رئیس الاحرار مرحوم کو منتخب کر لیا جائے تو اس پر علماء کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی۔ کسی بنا پر؟ یہ کہہ کر کہ محمد علی سند یافتہ مولوی نہیں ہیں۔ یہ واقعہ ہم نے مثال کے طور پر بیان کر دیا ہے۔ ورنہ وہ کون انسان ہے جسے مولوی حضرات سے اسی قسم کی باتیں سننے میں نہیں آتیں۔ آپ کوئی نہایت معقول بات کہئے۔ مولوی صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ وہ دلائل سے اس کی تردید نہ کر سکیگا۔ اور جب چاروں طرف سے عاجز آ جائیگا تو پھر بنیادی برہمنیت کا حربہ لے آئیگا کہ آپ نے کس مدرسہ سے سند حاصل کی ہے؟ اگر آپ کے پاس مدرسہ کی کوئی سند نہ ہوئی تو پھر آپ کی کوئی بات درخور اعتنا ہی نہیں سمجھی جائیگی۔ آپ مولوی صاحب کی غلطی پر انہیں متنبہ کریں۔ اپنی بات کی تائید میں قرآن کریم کے نصوص صریحہ سامنے لے آئیں۔ لیکن مولوی صاحب کے پاس اپنے معتقدین کے حلقہ کو فریب دینے یا یوں کہئے کہ اپنے آپ کو فریب میں رکھنے کے لئے ایک جواب کافی ہے۔ کہ آپ مولوی نہیں ہیں۔ گویا اب دنیا میں دین و دانش کی بات کہنے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے جو مولوی صاحب جیسی وضع قطع رکھے اور ان کے مدرسہ کی سند جیب میں ہو۔ جب یہ خصوصیات پیدا کر لی جائیں تو پھر اس کی مطلقاً ضرورت نہیں کہ آپ کی بات دین یا دانش کے مطابق ہو۔ عوام کو خوش رکھنے کے لئے جو جی میں آئے کہتے جائیے۔ آپ کی مولویانہ برادری میں سے کوئی آپ کے خلاف کچھ نہیں کہیگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ دین ہو یا دنیا معقول بات کہنے کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ اور پھر دین کے معاملہ میں تو علم کی ضرورت اور بھی لاینفک ہو جاتی ہے۔ کہ اس باب میں جہالت کی ایک

بات انسان کو دنیا اور عاقبت میں روسیاہ کر دیتی ہے۔ لیکن یہ بھی کیا ضرور ہے کہ علم آپ کی برادری میں شمولیت کا ہی نام ہو کسی دوسرے کے حصہ میں آ ہی نہ سکے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ کہنے والے کے پاس اپنی بات کی تائید میں کوئی سند بھی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دین کے معاملہ میں قرآن سے بڑھ کر اور کونسی سند ہو سکتی ہے۔

جناب پرویز صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھدیا کہ مسلمان نے قرآن کریم کے آیات (بالخصوص درود شریف) کا مصرف اتنا سمجھ رکھا ہے کہ ان کے الفاظ کا ورد کیا جائے۔ سوا سو الاکھ مرتبہ دہرا کر وظیفہ پڑھا جائے۔ کاغذوں پر لکھ کر گلے میں ٹکا لیا جائے یا گھول کر پی لیا جائے۔ وغیرہ۔ اس پر مولوی صاحبان کی برادری اور ان کے حاشیہ نشینوں نے کہرام مچا دیا کہ لیجئے یہ "ملحد" اب قرآن کی برکات اور درود شریف کے فضائل کا بھی منکر ہو گیا ہے۔ اور یوں اپنی جہالت کو عوام کے اشتعال میں چھپا لیا۔ جب ان سے کہا گیا کہ بجائی پرویز صاحب اپنے دعاوی کی تائید میں قرآن کریم کو پیش کرتے ہیں۔ آپ قرآن سے ان کی تردید کر دیجئے معاملہ صاف ہو جائیگا تو اس کے جواب میں وہی برہمنیت کا حربہ سامنے آگیا کہ کوئی مولوی صاحب سامنے ہوں تو ہم اُن کا جواب بھی لکھیں۔ یہ دفتر کے بابو دین کو کیا سمجھیں! اب کہئے کہ اس کا جواب سوائے حسرت آمیز خاموشی کے اور کیا دیا جائے۔

لیکن قدرت کی شان کہ بعض اوقات مولوی صاحبان کو خود اپنی برادری کے کسی فرد کی طرف سے ایسا جواب مل جاتا ہے کہ اس کے بعد کوئی بات بن نہیں پڑتی۔ اس لئے کہ جہاں "غیر مولوی" طبقہ میں ایسے لوگ پیدا ہو سکتے ہیں جنہیں اللہ نے دین کی روشنی سے بہرہ یاب فرمایا ہو وہاں مولوی صاحبان میں بھی ایسے حضرات نکل سکتے ہیں جنہیں اس نے صحیح قرآنی بصیرت عطا فرمائی ہو۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ عطا فرمائے اس وقت اتفاق سے اسی موضوع پر جس کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا جا چکا ہے۔ ایک "مولوی صاحب" کا مضمون ہمارے سامنے آگیا جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ صاحب مضمون جناب "قاری شاہ محمد خضر صاحب ندوی۔ پھلواری خطیب و امام و مفتی مسجد شاہی ریاست کپورتھلہ" ہیں۔ اور مضمون کا عنوان ہے۔

"کیا ہم آپ قاصر العقل ہیں"

غور فرمایئے کہ آپ کیا فرماتے ہیں۔

میری فاتر العقلی تو اس سوالیہ عنوان ہی سے ظاہر ہے۔ کہ آپ جیسے اہلِ عقل سے ایسا بھونڈا سوال کر رہا ہوں۔ لیکن کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ بھی اپنی عقل کا امتحان لیں؟ مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے وسیع الظرف میرے بے محل یا با محل سوال سے ہرگز ناراض نہ ہوں گے۔ کیونکہ کسی سوال کی حقیقت سمجھے بغیر سائل پر برس پڑنا مزید فتورِ عقل کا ثبوت ہوگا۔ اگر آپ غور فرمائیں گے تو اپنے آپ کو بھی میری ہی طرح عقل سے بیگانہ پائیں گے۔ فرق یہ ہے کہ مجھے اپنے دیوانے پن کا احساس ہو گیا ہے۔ اور آپ میں سے اکثر کی حالت مجھ سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔ اس لئے کہ خالی از عقل ہونے کے باوجود ادعائے عقل موجود ہے۔ اور سچی بات کے اظہار اور برمحل سوال پر بے عقلوں جیسا غصہ آ رہا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ آیئے اپنی اپنی عقل کا امتحان لیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ دیانت پیشِ نظر رہے اور غصہ نہ آئے

ایک مریض کو اسہال کا معالج ایک نسخہ لکھ دیتا ہے اور وہ مریض اس نسخے کو نہایت احتیاط سے لپیٹ کر لوبان کی دھونی دیتا ہے۔ اور چاندی یا چمڑے کے خول میں ڈال کر اپنے بازو پر باندھ لیتا ہے یا گلے میں لٹکا لیتا ہے۔ ایمان سے کہیے کہ آپ ایسے مریض کو پاگل نہیں کہیں گے؟

دوسرا مریض اپنے نسخے کو مشک و زعفران یا عرقِ گلاب میں گھول کر پی جاتا ہے۔ سچ کہیے کیا آپ اسے مجنون نہیں کہیں گے؟

تیسرا مریض اپنا نسخہ لے کر روزانہ صبح و شام باوضو پڑھ پڑھ کر سوا لاکھ ختم کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میری صحت کو اس سے بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ دیانتہً فرمایئے آپ اسے دیوانہ قرار دیں گے یا نہیں؟

ایک ملازم سے اس کا آقا کہتا ہے کہ "ہم نے جو تجھے چالیس روپئے دیئے ہیں ان میں سے ایک روپیہ فلاں کو دیدے" ملازم اپنے آقا کے اس جملے کو (یعنی "ہم نے جو تجھے چالیس روپئے دیئے ہیں ان میں سے ایک روپیہ فلاں کو دیدے") نہایت خوش آوازی، حروف کی صفائی اور خشوع و خضوع کے ساتھ بار بار زبان سے رٹتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے آقا کے

حکم کی تعمیل کرلی۔ سچ سچ کہئے ایسے ملازم کو آپ سودائی نہیں سمجھینگے؟ ایک دوسرے ملازم کو اسکا آقا ایک آرڈر، حکم، لکھکر بھیجتا ہے۔ ملازم اس حکمنامہ کو نہایت ادب سے لیکر چومتا سر پر رکھتا ہے اور نہایت خوبصورت کپڑے میں منڈھ کر کے احتیاط کیسا تھ اسے طاق پر رکھدیتا ہے۔ اس حکم کی تعمیل نہیں کرتا لیکن جب دل چاہتا ہے اسے کھول کر بار بار پڑھ لیتا ہے۔ اور چوم چاٹ کر پھر اُسے ادب سے طاق پر رکھ دیتا ہے۔ جیسے جیسے فرمایئے۔ آقا اس ملازم کو صحیح الدماغ سمجھے گا یا خبطی؟

تیسرے ملازم کو اس کا آقا ایک ایسی زبان میں آرڈر بھیجتا ہے جسے وہ ملازم سمجھتا نہیں ملازم اس کے الفاظ کسی سے پوچھ کر رٹ لیتا ہے۔ اور روزانہ اسی طرح ادب و احترام سے پڑھ لیا کرتا ہے۔ یہ سمجھنے کی ذرا کوشش نہیں کرتا کہ آقا نے اس میں لکھا کیا ہے وہ صرف ان الفاظ کو پڑھ کر اپنی جگہ سمجھ لیتا ہے کہ میں نے تعمیل حکم کرلی۔ انصاف سے کہئے کیا ایسے ملازم کو آپ سڑی نہیں تصور کرینگے؟

مجھے یقین ہے کہ ایسے مریضوں اور ملازموں کو صرف ایک ایک صفت کی وجہ سے آپ یقیناً پاگل کہیں گے۔ لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ان ملازموں اور مریضوں کی تمام یا اکثر صفات مجموعی طور پر ہم میں موجود ہوں۔ اور پھر بھی ہم اپنے آپ کو عاقل و فرزانہ ہی کہے چلے جائیں؟

وہ کونسی صفت ہے جو ان فرضی و مثالی مریضوں اور ملازموں میں ہے اور ہم میں نہیں ہے؟ حکیم مطلق ہمارے امراض کے لئے نسخہ تجویز کرتا ہے اور ہم اسے لپیٹ کر گلے میں آویزاں کرتے ہیں۔ یا گھول کر پی جاتے ہیں۔ یا کسی جز نسخہ کو معین تعداد میں پڑھ پڑھ کر ختم کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ نسخہ استعمال کرلیا۔ اب شِفَاءٌ لِلنَّاسِ یا شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْن ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں۔ آقائے مطلق ہمیں آرڈر اور حکم بھیجتا ہے۔ اور ہم اسے نہایت ادب اور خشوع و خضوع سے صرف تلاوت کرلیتے ہیں۔ الفاظ حکم کو کبھی سمجھ کر اور اکثر بے سمجھے بار بار دہراتے اور پھر چوم چاٹ کر ایک خوبصورت غلاف میں کسی اونچی جگہ پر رکھدیتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ آقا اس حرکت کا وہی اجر خوشی دیدے گا جو تعمیل حکم کا اجر ہو سکتا ہے۔

یہ پرجنون حرکت روزانہ کرتے ہیں تو خیر کرنے دیجئے۔ مزید جنون تو یہ ہے کہ اس جنون کا احساس ہونے کی بجائے اسی کو عین عقل و فرزانگی سمجھ رہے ہیں۔ اس پر مزید فاتر العقلی یہ ہے کہ اگر کوئی اس مجنونانہ حرکت کو فتورِ عقل قرار دے تو دیوانوں کی طرح لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ فرمایئے ایسے فاتر عقل کی عقل کس قدر قابل رحم ہے؟

آئندہ صفحات میں میری جو تحریر ہو گی وہ اسی "نسخۂ امراض" یا "حکم نامے" سے متعلق ہو گی جس کے ساتھ ہم آپ یہ مجنونانہ حرکات اب تک کرتے رہے ہیں۔ اس کے فہم کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ہم آپ اپنی اپنی جگہ فاتر العقل ہونے کا اعتراف کرلیں۔ ورنہ مزید فتور عقل کا گمان صحیح ہو گا۔ مریض اپنے کو مریض سمجھنے ہی سے منکر ہو تو کسی نسخے کو وہ استعمال ہی کیوں کرنے لگا؟ ہماری حرکتیں عجیب ہیں۔ اگر دوسرے کو یہی کچھ کرتے دیکھیں تو پاگل ہونے کا فتویٰ لگا دیں۔ لیکن خود ہی حرکات مدت سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور پھر بھی اپنے آپ کو اہل العقل سے کم نہیں سمجھتے۔ یہ مزید فتور عقل کا ثبوت ہے۔

آئندہ صفحات میں ہماری بحث کا موضوع یہ بھی ہو گا کہ یہ "نسخۂ امراض انسانی" یعنی قرآن کیا ہے۔ کیوں آیا ہے۔ کس لئے آیا ہے۔ اور ہمارا سلوک اس کے ساتھ کیا ہے؟ لیکن صدیوں کے جمے جمائے "جاہلی تصورات" کو الگ کئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ ہم قرآن پیش کریں اور آپ ملفوظات و مکتوبات سنائیں۔ ہم آیات دکھائیں اور آپ لیلیٰ مجنوں کے قصے کہانی سے استدلال کریں ہم قول الٰہی پیش کرتے ہوئے کہیں کہ لا الٰہ الا اللہ اور آپ قولِ منصور دکھائیں کہ انا الحق تو ظاہر ہے کہ اس طرح کام نہیں چلے گا۔

ہم آئندہ صفحات میں انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بھی بحث کریں گے۔ کہ توحید۔ اور شرک۔ الوہیت اور عبادت دین اور مذہب وغیرہ کے معانی کس قدر غلط ہمارے ذہنوں میں صدیوں سے بٹھائے گئے ہیں۔ اسلام و ایمان اور مسلم و کافر کا کتنا نادرست

مفہوم ہم اب تک سمجھے ہوئے ہیں۔ اور ان غلط فہمیوں کے باعث ہماری سعی و جہد کا محور کس قدر بدل گیا ہے۔ مقصود کہاں سے کہاں چلا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں سننے کے لئے ضروری ہیں۔ کہ غور و فکر کے ساتھ اور خالی الذہن ہو کر تحمل و تدبر کو باقی رکھتے۔ مقالات پڑھنے کی ضرورت ہے۔"

مضمون آپ نے ملاحظہ فرمالیا! کیا جناب پرویز صاحب (یا خود طلوعِ اسلام نے) اس موضوع پر اس سے زیادہ بھی کچھ کہا تھا؟ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اب مولوی کیا کریگا! وہ صاحب مضمون کے مولوی ہونے سے تو انکار نہیں کرسکتا۔ اس لئے انہیں دفتر کا بابو کہہ کر نہ ٹال نہیں سکتا۔ ان کے متعلق کہیگا کہ یہ وہابی ہیں چکڑالوی ہیں۔ اہل قرآن ہیں۔ اور پتہ نہیں کیا کیا ہیں! غرضیکہ ایک نہ ایک لیبل لگا دیگا اور خوش ہوجائیگا۔ کہ میں نے مُسکت جواب دیدیا اور نہیں سمجھے گا کہ اسکے اس جواب پر "عقل روتی ہے علم ہنستا ہے اور دین ماتم کرتا ہے۔"

یقین مانئے! ہمارے لئے (اور آپ کے لئے بھی) نہ تو کوئی پرویز سند ہیں نہ کوئی پھلواروی سند ہے قرآن کریم جس کے دعویٰ کے تائید میں قرآن شاہد ہو گا وہ ہمارے (اور آپ کے) سر آنکھوں پر۔ خواہ کسی کی طرف سے ہو۔ اور جس کے ساتھ یہ سند نہ ہو گی وہ دنیا کی نگاہوں میں کتنا ہی عظیم الشان علم کا سند رکیوں نہ ہو ہمارے نزدیک پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔

ہم آج بھی دعوت دیتے ہیں "مولوی صاحبان" اور ان کے تمام موئدین حضرات کو کہ ان میں اگر جرأت ہے تو آئیں اور قرآن کی سند سے ان حقائق کی تردید کریں۔ یونہی عوام کو بھڑکا کر خوش ہوجانا اپنے آپ کو فریب دے لینا ہے۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ہ

* * *

(۲) توہم پرستی

بالعموم سمجھا یہ جاتا ہے کہ توہم پرستی جہالت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور علم کی روشنی میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بات ہے بھی ٹھیک۔ لیکن بعض علم ایسے ہوتے

ہیں کہ ان میں اور جہالت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا - اور یہ وہ علوم ہیں جو خالص دانش برہانی کے رہین منت ہوتے ہیں - دانش نورانی کا ان میں کوئی دخل نہیں ہوتا - جب ہم پڑھتے تھے کہ یونان کے حکماء بایں ہمہ علم و فضل - دیوی - دیوتاؤں کے پرستار تھے تو اس کھلے ہوئے علمی تضاد پر ہنسی آجاتی تھی - لیکن یہ چیز کچھ عہد قدیم کے یونانیوں ہی سے مختص نہ تھی آج بھی یہ حالت ہے کہ یورپ - تہذیب و تمدن کی اس تمام روشنی کے باوجود توہم پرستی کی انتہائی جہالت میں گرفتار ہے اکثر دیکھا گیا کہ ہندوستان کے ایرے غیرے منجم و جفار (اور وہ بھی یونہی پیشہ ور عطائی سے) یورپ میں جاکر ڈھیروں روپیہ کما لاتے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے زیادہ تر وہاں کی عورتیں ذمہ دار ہوں - لیکن ایک مثال ایسی بھی ہمارے سامنے آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں یہ توہم پرستی جہلا ، یا طبقۂ اناث تک ہی محدود نہیں بڑے بڑے مشاہیر اس میں گرفتار ہیں - ایک صاحب ہیں میجر جرنل کولنس - انہوں نے پچھلے دنوں جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے ریڈیو پر فرمایا -

"جبل الطارق میں یہ ایک پرانی مثل مشہور ہے کہ جب تک وہاں بندروں کی افزائش ہوتی رہیگی حکومت برطانیہ کا جھنڈا لہراتا رہیگا - ایک مدت سے بندروں کی تعداد میں کمی ہوتی چلی جارہی تھی - لیکن حال ہی کے اعداد و شمار سے معلوم ہوا کہ وہاں کے بندروں میں اب پچاس فیصدی کا اضافہ ہوگیا ہے - اس لئے جبل الطارق میں سب خیر و عافیت سمجھو" (ہندوستان ٹائمز ۴۴-۳-۱)

اب تو بندروں کے تقدس میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا - کیونکہ اس کی سند یورپ سے بھی مل گئی ہے !

---

(۳) پاکستان کے خلاف

ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں (اور اس حقیقت کی صداقت میں شبہ بھی کیسے ہو سکتا ہے) کہ ہندوؤں کی طرف سے پاکستان اسکیم کی مخالفت کا واحد سبب یہ ہے کہ اس سے ان کے "ہندوستان میں ہندو حکومت" کے خواب پریشان ہوئے جاتے ہیں - ہر چند ہندو لیڈروں نے اس اصلی وجہ کو مختلف نقابوں میں چھپانے کی ناکام کوشش

کی لیکن سچی بات کسی نہ کسی طرح زبان تک آہی جاتی ہے۔ مسٹر منشی (سابق منسٹر کانگرس گورنمنٹ بمبئی) سیاسی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ حال ہی میں کانگرس سے الگ ہوئے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ انہیں کانگرس کے دعاوی اور اصول سے اختلاف ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ ان ... مقاصد کے حصول کے لئے عند الضرورت تشدد کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ کانگرس سے علیحدگی پر انہوں نے اپنی تمام جدوجہد کا مرکز پاکستان کی مخالفت قرار دیا ہے۔ اور وہ اب اس مقصد کے لئے سارے ہندوستان کے مختلف الخیال ہندوؤں (اور مسلمان قومیت پرستوں) سے مبادلۂ خیالات کرتے پھر رہے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے اپنے ایک بیان میں فرمایا۔

> ”میرا عاجلہ مقصد یہ ہے کہ تمام ہندوستان کے باشندوں کی توجہات کو اس نقطہ پر مرکوز کردوں کہ وہ تقسیم ہند کی اسکیم کی مخالفت کریں۔ اس لئے کہ میرے نزدیک یہ اسکیم ایسی ہی بری ہے جیسی یہ تحریک کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا جائے۔“ (ہندوستان ٹائمز ۲۲ ۴/۴۴)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ہندوؤں کے نزدیک علیحدگی کی اسکیم کیوں قابل مذمت ہے اسلئے کہ اس سے ہندوستان میں ہندو اکثریت۔ اقلیت میں تبدیل ہوجاتی ہے ہندوؤں کی طرف سے تو اس اسکیم کی مخالفت ہونی ہی تھی۔ لیکن ذرا پوچھئے ان قومیت پرست مسلمانوں سے کہ وہ اس کی مخالفت کس جذبہ کی بنا پر کر رہے ہیں؟

---

(۴) چہ خوش متحدہ قومیت۔ متحدہ ملک۔ متحدہ کلچر کے متعلق ایک دلچسپ ثبوت ملاحظہ فرمائیے گذشتہ انڈین سول سروس کے امتحان میں ایک صاحب ڈاکٹر سچیدانند بھی انٹرویو بورڈ (ملاقاتی مجلس) کے ممبر تھے انہوں نے امیدواران (طلباء) کی ملاقات کے تاثرات کو ایک مضمون کے صورت میں قلمبند کر کے شائع فرمایا ہے جس کے دوران میں آپ رقمطراز ہیں۔

> ”سوائے ایک پنجابی طالب علم (امیدوار) کے جسکا خیال تھا کہ پاکستان اسکیم شاید فرقہ دارانہ مسئلہ کا حل بن سکے باقی تمام مسلم امیدواراں نے (جن کی تعداد چھتیس تھی) بڑی

شدت سے اس خیال کا اظہار کیا کہ علیحدگی کی اسکیم کو جلد از جلد مرفوع القلم قرار دیدینا چاہئے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ اسکیم معاشی اور عسکری وجوہات کی بنا پر یکسر ناقابل عمل تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ اسکیم فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل ہونے کے بجائے اس مسئلہ کو اور پیچیدہ بنا دیگی۔

ڈاکٹر سنہا صاحب اس پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کیا ان نوجوانوں نے جن میں بعض ملک کے انتظام میں اعلیٰ مناصب پر فائز ہونگے مسلم لیگ کی لٹیا ہی نہیں ڈبودی جسکا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ملتِ اسلامیہ کی ترجمان ہے! کیا ان کا یہ طرزِ عمل قائدِ اعظم کی طرف کا ایک فرمان شائع کرنیکا مستوجب نہیں کہ یہ لڑکے مسلمانوں کے صحیح نمائندے نہیں ہیں" بالکل یہ مسلمانوں کے صحیح نمائندے تو صرف وہ لوگ ہیں جو پاکستان کی اسکیم کے مخالف ہیں!

اب ذرا آگے بڑھئے۔ کلچر کے متعلق بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

"سوائے سکھوں کے جن کا امتیازی نشان ان کی ڈاڑھی اور مونچھ تھے۔ باقی امیدواران کے لباس اور وضع قطع سے کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان! ان ۴۰ امیدواران میں سے ایک کے سوائے باقی سب مغربی وضع کے لباس میں ملبوس تھے۔ اور سکھوں کے علاوہ سبکے سب کرزن فیشن"

اس پر ڈاکٹر صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔

"یہ حقیقت کہ ان تمام امیدواران کے ذہنی تصورات، اخلاقی معیار اور سیاسی مطالبات قریب قریب ایک جیسے تھے اس دعوےٰ کی محکم دلیل ہے کہ ہندوستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں" (ہندوستان ٹائمز ۱۹۴۳ء)

معلوم نہیں ان ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق انیق جوہر شناسانِ مغرب کے سامنے بھی آئی ہے یا نہیں۔ ورنہ انہیں نوبل پرائز ملنا چاہئے تھا۔ یہاں کتنے کتنے بڑے محقق موجود ہیں لیکن افسوس ہے کہ کوئی قدردان نہیں۔ کوٹ اور پتلون کی یکسانیت سے ذہنی، اخلاقی، سیاسی تصورات و معتقدات کی یکسانیت کا پتہ چلا لینا کسی نکتہ ذرہ رس ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

باقی رہا یہ کہ ان مسلمان امیدواران نے اپنے انٹرویو میں پاکستان اسکیم کی مخالفت کر دی تو ظاہر ہے کہ جب انہیں اپنے سامنے ڈاکٹر سنہا جیسے ممتحن نظر آئے ہوں گے تو انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی ہوگی۔

ناسزا ئے راچو بینی بختیار عاقلاں تسلیم کردن اختیار

ہم نہیں سمجھ سکے کہ ڈاکٹر سنہا جیسے بزرگوں کو حلقۂ ممتحنین میں شامل کرنا اور پھر طالبعلموں سے ان

بَابُ المُراسِلات

محترمی اخوندزادہ صاحب ۔ سلام مسنون ۔ براہ کرم ذیل کی چند سطور طلوعِ اسلام میں شائع فرما کر شکر گزار فرمائیں ۔ ہر چند نفس مضمون کا زیادہ تعلق میرے ذاتی جذبات سے ہے ۔ لیکن چونکہ معارف القرآن سے ادارہ اور قارئین طلوعِ اسلام کو بھی ایک خاص تعلق ہے اسلئے طلوعِ اسلام میں اس کی اشاعت مناسب سمجھتا ہوں ۔ درحقیقت ان جذبات کے اظہار کا صحیح مقام معارف القرآن کا "تعارف" تھا لیکن یہ اس وقت سامنے آئے جب کتاب چھپ چکی تھی ۔

فنونِ لطیفہ میں خطاطی کو بھی ایک خاص مرتبہ حاصل ہے ۔ خطِ نسخ ضرورت کے لحاظ سے ایجاد ہوا لیکن مسلمانوں کے حسنِ ذوق نے اس میں شانِ مصوری پیدا کر کے اسے نستعلیق کے قالب میں ڈھالا اور پھر اس فن میں وہ کمال پیدا کیا کہ بعض اوقات اس کے ایک عمدہ نمونے کے سامنے اچھی اچھی تصویریں ماند پڑ جاتی ہیں ۔ چونکہ اس کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہو گیا اسلئے ظاہر ہے کہ کاروباری دنیا میں اس کا چلن نہیں ہو سکتا تھا ۔ کاروباری دنیا میں اقدار کے پیمانے کچھ اور ہوتے ہیں اور "نگاہ" کی دنیا میں اس سے بالکل مختلف ۔ لہٰذا جوں جوں دنیا "کاروباری" ہوتی چلی گئی اس فن کی قدر بھی کم ہوتی چلی گئی اور آج وہ عام کتابت کی سطح پر آ گئی ۔ بایں ہمہ ہر دور میں ایسے صاحبانِ کمال بھی ہوتے ہیں جو کاروباری دنیا کے پیمانوں سے بے نیاز ہو کر فن کی تکمیل اپنے ذوق کی خاطر کرتے ہیں ۔ دنیا ان پر ہنستی ہے لیکن یہ دنیا پر ہنستے ہیں ۔

ہمارے دور میں بھی اسی قسم کے ایک صاحبِ فن موجود ہیں دنیا انہیں یوسف کے نام سے پکارتی ہے اور جہاں تک میری نگاہ جا سکی ہے میرا اندازہ ہے کہ وہ اس فن کے امام ہیں ۔ انگریزی ۔ عربی ۔ فارسی اردو میں اعلیٰ استعداد ، مطالعہ وسیع ، شعر و ادب میں مذاق نہایت شستہ ، نگاہ باریک بین ، اور دل

اخلاص کا سر چشمہ ۔ ہر فطین (GENIUS) کی طرح اپنے فن میں جذب ، لہٰذا زندگی کے دوسرے شعبوں میں ناکام ۔ "تکمیل" (PERFECTION) مطمح نگاہ اسلئے وقت اور قیمت کے پیمانے بالکل جداگانہ ۔ کمال اتنا کہ راہ چلتے دو چار اُلٹے سیدھے خطوط کھینچ دیں تو دس پندرہ روپے روزانہ کما لینا بالکل معمولی بات لیکن تقاضائے ذوق یہ کہ جب تک کوئی کام اپنی نگاہ کے ترازو میں پورا نہ اُترے، یوسف کے نام سے منسوب نہ ہو سکے ۔ بسا اوقات دیکھنے میں آیا کہ ایک نادرہ کار ٹکڑہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے ، دیکھنے والوں کی نگاہوں میں جلا پیدا ہو رہی ہے ۔ جس کا کام ہے اُسے بھی عجلت ہے ، اجرت کا پوچھئے نہیں ، لوگ اشارے کے منتظر ہیں ۔ لیکن یوسف صاحب نے اس پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور اُسے اٹھا کر پھینک دیا کہ اُن کی نگاہ دوررس نے ایک ایسے فنی نقص کو بھانپ لیا جس تک کسی اور کی نگاہ شاید ہی پہنچ سکتی ۔

ایسا شخص آج کی کاروباری دُنیا میں ناکام نہ رہے تو اور کیا ہو !

میں چاہتا تھا کہ معارف القرآن کا ٹائیٹل یوسف صاحب تیار کر دیں کچھ تھوڑی سی جان پہچان بھی تھی اور احتیاطاً میں نے تین ماہ کا وقفہ بھی سامنے رکھ لیا تھا ۔ ٹائیٹل تیار ہوا اور ایسا کہ جس نے دیکھا آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔ مجھے بڑا اطمینان ہوا ، ٹائٹل لاہور بھیج دیا گیا ، اس کا بلاک تیار ہو گیا ، چھپنے کو ہی تھا کہ ایک دن یوسف صاحب تشریف لے آئے اور کہا کہ اگر ٹائٹل ابھی تک چھپا نہ ہو تو اُسکی طباعت رکوا لینا ۔ چھپ گیا ہو تو ضائع کرادو ۔ یہ میری درخواست ہے ۔

میں نے اسکی طباعت رکوا دی ، اُن کی بات میں کچھ ایسا ہی اثر تھا ۔ تین مہینے گزر گئے ، کتاب چھپ گئی منتظر نگاہوں کا اضطراب بڑھتا گیا ، لیکن نقص دور ہونے کے بعد ٹائٹل واپس نہ آیا ۔ مسلسل تقاضے بھی یوسف صاحب کے استغراق میں خلل انداز نہ ہو سکے ۔ تین مہینے کے بعد وہ آئے اور ایک نیا ٹائیٹل اپنے ساتھ لائے ۔ کہنے لگے یہ میرے فن کا شاہکار ہے ، میرے تصورات کی تکمیل ہے اب میرے دل میں کوئی حسرت باقی نہیں رہی ، اسکے بعد میں اس سے بہتر کچھ اور نہیں لکھ سکوں گا ۔ !

ٹائٹل بالکل سیدھا سادہ ہے اور معارف القرآن کا مطلع ۔ ارباب ذوق مجھ سے متفق ہونگے کہ جو کچھ یوسف صاحب نے کہا ہے اسمیں ذرا بھی مبالغہ نہیں ۔

ٹائیٹل کے علاوہ دوسرا ورق (حسنِ مطلع) بھی نیا تیار کر لائے یہ بھی اپنے انداز کی ایک ہی چیز ہے حتی کہ کتاب کے آخیر ایک مختصر سی اطلاع درج کرنی تھی اسے بھی انہوں نے اپنے فن کی زبان میں ادا کر دیا۔

کہنے لگے کہ کام تو یہ سارا دو تین گھنٹے کا تھا لیکن میں نے پورے تین مہینے اس پر صرف کر دیئے ہیں۔ میں اس میں "تکمیل" پیدا کرتا تھا۔ فن کا تکمیلی شاہکار یا تو کسی شاہجہاں کا خزانہ تیار کرا سکتا ہے یا کسی میرے جیسے فقیر کا عشق۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی۔

میں حیران تھا کہ انہوں نے میری خاطر اتنا وقت اس پر صرف کر دیا۔ وہ وقت اور محنت جس کی "بازار کے بھاؤ" سے بھی قیمت سینکڑوں تک پہنچ جائیگی۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے اتنی محنت کیوں کی۔ کہنے لگے۔ کہ پہلے ٹائیٹل میں بھی نقص کوئی نہیں تھا۔ لیکن اسے اس نگاہ سے بنایا تھا کہ ایک کتاب کا ٹائیٹل ہے اس کے بعد ایک دن تمہاری غیر حاضری میں معارف القرآن کے پروف کا کچھ حصہ نظر سے گذرا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ ٹائیٹل اس کتاب کا نہیں بن سکا! میں نے فیصلہ کر لیا کہ جس طرح تم نے اس کتاب کو خونِ جگر سے لکھا ہے میں بھی اس کے ٹائیٹل کو دل کی رنگینی سے مرتب کروں۔ میرا عشق کامیاب ہو گیا۔

میں ان کی باتیں سن رہا تھا لیکن محویت کے عالم میں۔

میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ کیا پیش کر دوں؟

یوسف صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا۔ میں نے جھٹ سے محسوس کر لیا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی!

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان کی نگاہیں جھک گئیں۔ اور آہستہ سے کہا کہ :-

"پرویز صاحب! سوزِ عشق کی قیمت؟"

"اتنا بخل کس لئے کہ قرآن کی خدمت میں میرا اتنا حصہ بھی نہ رہنے پائے"! میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ معارف القرآن کی یہ حیثیت ہو یا نہ ہو جو یوسف صاحب نے اپنے دل میں متعین کی۔ لیکن یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ بازارِ مصر میں ایک بڑھیا کی سوت کی انٹی اس طرح یوسف کو خرید لیا کرتی ہے۔

یوسف صاحب میرے شکریے کی حدود سے بہت آگے ہیں۔ اور ان آئین سے کہیں بلند! یہ سطور محض اپنے دل کی تسکین کے لئے لکھ رہا ہوں۔ نہ کہ اُن کے لئے۔ پرویز - منت نور جہاں روڈ نئی دہلی